ھسپنگ سے آگے
سید محمد اطہر شہزاد

ہسپنگ سے آگے

کوشش کریں گے 6

دو۔۔چار ہو گئے 12

روانگی اور سفر کی پہلی شام 20

شفاف ندیاں، جھرنے آبشاریں۔۔اور ہم پھنس گئے 26

عظیم پہاڑوں کا سنگم 35

مشکلیں اتنی پڑیں ہم پہ۔۔۔ 42

سفر ہو تو ایسا، سواری ہو تو ایسی 47

پہنچے پہلی منزل پر 56

اب کہاں جائیں 62

گونڈوگورو سے کنکورڈیا جاؤ! 66

سکردو، شہر بے مثال 77

چھ گلیشیروں کی سرزمین میں 84

ہوشے کے پراسرار مینار اور مشہ بروم 93

جونی اردو بولتا ہے 101

بلندیوں کے بلند لوگ 104

پورٹر نو پرابلم ان ہوشے 107

ہوشے کا دیوا اور اندھیری رات 112

پانی میں بہتے پتھر 120

ریت کی دیوار، دیوار میں پتھر اور نیچے۔۔ 125

گونڈوگورو گلیشیر 132

لیلیٰ 135

مختصر قبیلہ، سادہ تمنائیں 140

پہاڑ ہمیں دوست بنا دیتے ہیں! 145

منفی بیس درجے کی چاندنی رات 153

ایولانچ، ڈی ہائیڈریشن، واپسی 157

کوشش کریں گے

ہم کمر تک برف میں دھنسے ہوئے تھے___

ہمارے کندھوں پر رک سیکوں کا وزن تھا___

شدید تھکاوٹ اور برفانی ہواؤں نے ہمارے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیئے تھے___

یاسر، عظیم اور ہمارے چاروں پورٹر پتھروں اور برفوں کے اس لامحدود نشیب و فراز میں دور بہت ہی دور کہیں گم ہو چکے تھے۔ اور نقطہ انجماد سے کہیں نیچے کے درجہ حرارت میں دھنسے ہمارے وجود چند ہی لمحوں میں شروع ہونے والی رات کے خیال کو ذہن سے جھٹلانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے___

چند سو میٹر کے فاصلے پر برف پوش لیلیٰ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ___ ہمارے سامنے کھڑی تھی اور اس شام کے سورج کی آخری کرنیں چوٹی کی تکون پر اب آہستہ آہستہ اوپر کی طرف سرکتی واضح نظر آ رہی تھیں___

ہمیں اس گلیشیئر پر راستہ بھٹکے ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے اور اب ہر گزرتے لمحے کا احساس شدت کے ساتھ ہو رہا تھا۔

جب ہم اس جگہ پہنچے تھے تو اس چوٹی کی چمکدار بھوری دیواریں اور ڈھلوانوں پر جمی برفیں سورج کی سنہری دھوپ میں جگمگاتی تھیں___ اور اب جب کہ شام کی آخری ساعتیں نزدیک آتی تاریکیوں کا استقبال کر رہی تھیں، بلند ڈھلوانوں پر جمی برفیں نہایت تیزی سے سرمئی چاندی کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھیں___

مجھ سے چند ہی قدم کے فاصلے پر زاہد اپنے وزنی ڈیل ڈول کے ساتھ برف میں دھنسا اپنی سٹک کو ادھر ادھر برف میں پیوست کر کے کچی برف کی گہرائی کا اندازہ بلکہ کسی پوشیدہ برفانی کھائی کے خطرے سے بچاؤ کی کوشش کر رہا تھا___

اگرچہ سانسوں کی آمد و رفت منہ سے نکلنے والی بھاپ کی صورت میں ہماری زندگی کا پتہ دے رہی تھی لیکن ہم دونوں بہت دیر سے خاموش اس برفانی سرزمین میں اپنی بے بسی کی تصویر بنے کھڑے تھے___ ہمارے ذہنوں میں زندگی میں پہلی مرتبہ مایوسی کے وہ خیالات سر ابھار رہے تھے جن سے پہلے ہم کبھی آشنا نہ ہوئے تھے___

اعصاب کو منجمد کر دینے والے اس سکوت کو بالآخر زاہد نے توڑا___ اس نے اس یقینی برفانی موت سے نکلنے کی موہوم سی امید کا اظہار ایک سوال کی صورت میں کیا___

"شاہ جی! سلیپنگ بیگ ہیں؟____"

اپنی اس حماقت کی شدت کو میں بہت دیر سے اپنے ذہن سے محو کرنے کو کوشش کر رہا تھا کہ اپنے رک سیک کا وزن کم کرنے کے لیئے کیا سلیپنگ بیگ ہی پورٹرز کو دیا جانا ضروری تھا؟___

"نہیں!"___

جواب یقیناً مایوس کن تھا لیکن کوئی اور جواب میرے پاس تھا بھی نہیں!

صاف نظر آ رہا تھا کہ گونڈوگورو گلیشیئر میں دھنسے ہمارے بھوک اور تھکاوٹ سے نڈھال وجود زیادہ دیر اس اذیت ناک ٹھنڈ کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔

☆☆☆☆☆

"یار شاہ جی___ اس دفعہ کا پروگرام کچھ زیادہ ہی اوکھا نہیں رکھ لیا؟" یاسر نے چائے کی چسکی لگاتے ہوئے نہایت چبھتے لہجے میں پوچھا۔

"ہم میں اور اس ٹریک میں کوئی میل ہی نظر نہیں آ رہا۔"

"بھئی دیکھو___ اب ہم اتنی دفعہ چھوٹے موٹے گلیشئروں اور درہ خنجراب جیسی اونچی جگہوں سے ہو آئے ہیں___ اور آہستہ آہستہ سامان بھی اکٹھا ہو ہی گیا ہے تو اب بھی ذرا مشکل ٹریک کا نام سن کر تمہاری جان نکل رہی ہے؟" میں نے یاسر کی حوصلہ افزائی کے لئے کہا۔

"لیکن وہ تو یار___ دو تین دن کی بات ہوتی تھی کہ ہم کسی پہاڑ کے بیس کیمپ سے ہو آتے تھے___ اکٹھے بارہ پندرہ

دن گلیشیر پر اور وہ بھی بالتورو پر___ کیا میرے سر پر سینگ نظر آ رہے ہیں تمہیں یا میری دم نکل آئی ہے!"

یاسر ابھی تک خوف زدہ تھا۔ بالتورو گلیشیر پر کئی دن رہنے کے تصور نے اس کے تاثرات ہی بدل دیئے تھے اور وہ میری کسی بات کو وقعت دینے پر تیار نظر نہیں آ رہا تھا۔

لیکن ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہو رہا تھا۔۔

ہر سال ہم میں سے کسی کو بھی موسم کا پہلا پسینہ آئے تو گلگت بلتستان کی یاد دل میں کلبلانے لگتی ہے___ گلگت___ سکردو___ قراقرم___ ہمالیہ کی وادیاں اور چوٹیاں___ گلیشیر اور ان سے نکلنے والے لاتعداد دریا___ نیلگوں جھیلیں اور خوابناک سبزہ زار___

فوراً فون کئے جاتے ہیں، ملاقاتیں ہوتی ہیں اور اس دفعہ کے پروگرام کی فرمائش ہو جاتی ہے۔ فرمائش چند دن کا ایک نوٹس ہوتا ہے جس کے اندر اندر تفصیلی پروگرام پیش کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔

احکامات وصول ہوتے ہی فدوی ٹریک کی تلاش میں جت جاتا ہے۔

ٹریک کا انتخاب میرے ذمے لگا کر اور مکمل حمایت کی یقین دہانی کرا کے ٹیم عین وقت پر بغاوت کر دیا کرتی ہے۔ انتہائی بحث و مباحثے، منتوں اور دھمکیوں کے بعد کہیں جا کر میں انہیں قائل کر پاتا ہوں کہ منتخب کردہ ٹریک ہی اس دفعہ مناسب رہے گا۔

انٹرنیٹ، گوگل ارتھ، نقشے، ٹریکنگ گائیڈز اور طرح طرح کے ذرائع اختیار کرنے کے بعد علاقے اور روٹ کی سفارشات تیار ہوتی ہیں۔ سفارشات مرتب کرتے ہوئے ٹریک کی خوبصورتی اور سختیاں، متوقع ٹیم ممبران کی طاقت، وسائل اور دنوں کا خیال بھی رکھنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ مرحلہ آتا ہے جس میں جمع کردہ معلومات بیان کرنے کے بعد کٹہرے میں کھڑے ایک ملزم کی طرح تمام ٹیم کی جراح کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ میں اچھی طرح ان علاقوں کی سیاحت کر آیا ہوں اور اب ان کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینے کے لئے اشارے کا منتظر ہوں!

اچھا تو ہنزہ اور نگر آمنے سامنے واقع ہیں___ تو راکاپوشی کے لئے راستے میں پہلے ہی بس سے اترنا ہوگا، پھر ہنزہ کیسے جائیں گے؟___ علی آباد سے ہوپر تک جیپ جائے گی یا ویگن؟___ دن کم نہیں ہو سکتے؟___ خنجراب میں ہوٹل ہیں نا رہنے اور کھانے کے لئے؟___ کیلاش پہلے آتا ہے یا چترال؟___ استور سے دیوسائی کا راستہ

خوبصورت ہے نا؟___

عموماً یہ پروگرام سب دوستوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی جن کے جانے کا امکان ہو وہ بھی اور جن کا امکان نہ ہو وہ بھی۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ___

شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات___ یعنی تمام دوست تیار ہو جائیں اور سفر کا لطف دوبالا ہو جائے۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ حجتیں زیادہ ان کی طرف سے ہی آتی ہیں جنہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ نہیں جا سکیں گے یا ٹریکنگ جن کا شوق ہی نہیں ہے___ وہ نت نئے زاویوں سے تنقید اور سوالات کی بوچھاڑ سے ہمارے پروگرام کا ستیاناس کرنے کی مکمل کوشش کرتے ہیں اور اس معاملے میں ایسے یک زبان ہو کر تنقید کرتے ہیں کہ کسی متحدہ محاذ سے مقابلے کا گمان ہوتا ہے۔

جن کا جانے کا امکان ہو___ ان کی مجبوریوں کو ہزار ہا خدشات کے ساتھ پیش کریں گے___ کوئی اکیلا ممبران کے ہتھے چڑھ جائے تو اس کو ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے ارادے سے باز آ جائے اور بعد میں وہ ہمارے کمزور ارادوں کا مذاق اڑا سکیں۔

لیکن یہ شوق بلکہ جنون جو ایک ٹریکر کے دل میں ہوتا ہے___ وہ کہاں کسی کے قابو میں آتا ہے___ ہر قسم کی مخالفت اور دل شکستہ باتوں کو سن کر دل میں یہی تہیہ کر لیا جاتا ہے کہ___ بچو یہ تو واپس آ کر دیکھیں گے جب اپنے منہ کھولے قصے سنو گے ہم سے اور اندر ہی اندر جلو گے___ تب ہم مزے لیں گے___

لیکن پہلا ضروری کام یہ ہوتا ہے کہ اپنے ہم خیال دوستوں کو مکمل رضامند کیا جائے___ اور اس وقت یہی کام میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مغل صاحب! دیکھیں نا___ آپ نے نانگا پربت بیس کیمپ کر لیا___ راکاپوشی کو بھی ہاتھ لگا آئے___ مشہ بروم کے تو سینے تک پر چڑھ آئے___ دیوسائی میں ریچھوں سے بچ کر نکل آئے اور___ کیلاش کی وادیاں بھی آپ نے جی بھر کر دیکھ لیں! اب کیا آپ کا دل نہیں کرتا کے___ دنیا کے سب سے عظیم___ مشہور اور___ حسین ترین___ کنکورڈیا ٹریک پر آپ کے قدم بھی پڑیں؟"

دال گلتی نظر نا آتے ہوئے میں نے ایموشنل بلیک میلنگ اور پچھلے تجربات کو بڑھا چڑھا کر پیش کر کے یاسر کو قائل کرنے کی کوشش شروع کی۔

"ہاں___یار، نانگا پربت کوتو ہم نے ہر طرف سے ہی دیکھ لیا___فیری میڈوز سے بھی___ تراشنگ سے بھی اور راما جھیل سے بھی___ کیا بات ہے نانگا پربت کی___ کیا قدرت ہے اللہ کی___ سبحان اللہ___ اور یاد ہے ناوہ گلیشیر___وہ جو بیال سے آگے جا کر آ گیا تھا___ جسم کی ساری چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں اس نے___ لیکن ہم نے بھی کمال ہی کیا تھا___ شام سے پہلے بیس کیمپ سے ہو کر واپس فیری میڈوز پہنچ بھی گئے تھے___ فیری میڈوز کیمپنگ سائٹ کا مالک پختون خان تو مان ہی نہیں رہا تھا کہ ہم بغیر گائیڈ کے چھ سات گھنٹے میں ہو کر بھی آ گئے___ نانگا پربت نانگا پربت ہے___یار سنا ہے___کے ٹو اس بھی بہت بڑا ہے؟ وہ کیا بلا ہو گی___ لیکن ہمارا روٹ کیا ہو گا کنکورڈیا کے لئے؟"

یاسر پٹری پر چڑھنے لگا۔۔۔

☆☆☆☆☆

ٹریکنگ کے اس جنون نے ہمیں گھاٹی گھاٹی، دریا دریا، جنگل جنگل اور پیرودہائی! کہاں کہاں کے چکر نہ لگوائے___

جی ہاں پیرودہائی!

جو لوگ اس عظیم رومانوی نام سے آشنا نہیں ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ راولپنڈی اور اسلام آباد سے پاکستان بھر میں 'پیرودہائی' سے سفر شروع کیا جا سکتا ہے___ اور ہمارے لئے خصوصی طور پر گلگت بلتستان کے سفر کے حوالے سے اس مقام کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوئی۔

ہوائی جہاز کے ذریعے گلگت اور سکردو کے لئے عازم سفر ہونے میں ہمیں بہت سے قباحتیں نظر آتی ہیں___ پہلے سیٹ کنفرم ہونے کا مسئلہ، کئی مہینے پہلے ٹکٹ لے کر اس کے مطابق چھٹی، اخراجات، ٹیم ممبران کی دستیابی اور دیگر تمام ضروریات کا اندازہ لگانا آسان نہیں___

اگر ان تمام لوازمات کا بندوبست کر کے ٹکٹ لے بھی لیں، کنفرم کروا بھی لیں، جہاز اڑ بھی جائے لیکن موسم کی خرابی کے باعث لینڈ نا کر سکے تو؟

یہ تو روز کا معمول ہے___ اگلے دن پھر سے صبح صبح ائیر پورٹ اور موسم، واپسی اور پھر اگلے دن___!

اس لئے بہتر یہی ہے کہ ان تمام بکھیڑوں سے بچ کر پیرودہائی سے نیٹکو، مشہ بروم یا سلک روٹ کی کوئی بس پکڑیں اور براستہ شاہراہ قراقرم گلگت بلتستان کے لئے عازم سفر ہو جایا جائے___ خیر سے گلگت یا سکردو پہنچنے تک جسمانی حالت زیادہ اچھی تو نہیں رہتی لیکن اس سفر میں جو مزا ہے وہ جب تک آپ خود نہیں اٹھائیں گے آپ کو سمجھ نہیں آئے گا۔

شاہراہ قراقرم کا سفر ہو تو___ ہر پل رنگ بدلتے نظارے___ منفرد ترین قدرتی عجائب، طرح طرح کے علاقوں میں پڑاؤ اور بھانت بھانت کے کھانے___

ایک دفعہ تھاکوٹ میں دریائے سندھ کے پل پر ہمارے ایک دوست نے پوچھا تھا کہ کیا ہم اس سفر میں شاہراہ قراقرم سے بھی گزریں گے؟___

موصوف پہلی مرتبہ ٹیکسلا سے آگے گئے تھے اور پڑھنے کی حد تک ہی شاہراہ قراقرم کے نام سے واقف تھے۔ اس سفر میں انہیں خنجراب تک کا علاقہ دیکھنے کا موقع ملا اور اب ان کی نظر میں پاکستان بہت بڑا___ بہت حسین اور بہت بڑی نعمت ہے۔

خیر بات ہو رہی تھی عظیم سیاحتی وثقافتی ورثے پیرودہائی کی۔

پیرودہائی کے لئے ٹیکسی کا بندوبست کرنا بھی بجائے خود ایک بڑا کارنمایاں کا درجہ رکھتا ہے___ اکثر ٹیکسی ڈرائیور تو پیرودہائی کا نام سنتے ہی کچھ کہے بغیر گاڑی لے بھاگتے ہیں___

راولپنڈی اور اسلام آباد کو دو حصوں میں تقسیم کرتی اور ایک سرحدی حیثیت کی حامل آئی جے پرنسپل روڈ سے پیرودہائی اڈے تک بمشکل ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہے___ آئی جے پرنسپل روڈ کے پیرودہائی چوک تک تو ٹیکسی والے بخوشی راضی ہو جاتے ہیں لیکن اڈے تک لے جانے پر رضامند کرنے کے لئے بہت سی منت سماجت اور خاطر خواہ کرائے کی پیشکش کے علاوہ کوئی طریقہ ہم اب تک دریافت نہیں کر سکے___

اس رویے کی وجہ امن وامان کی صورتحال یا کسی نامناسب ٹیکس کی ادائیگی ہرگز نہیں___ بلکہ سبب اڈے تک پہنچنے والی وہ سڑک ہے جو بیشمار موٹر مکینکوں کے گھر کا چولہا ایک عرصے سے نا صرف جلانے بلکہ جلتا رہنے کا باعث ہے___ تین تین فٹ تک کی گہرائی کے سیوریج اور بارشوں کے پانی سے لبریز گڑھے___ جو بھاری بسوں اور ٹرکوں

کی چوبیس گھنٹے آمدورفت کے باعث بہتات میں ہیں، چھوٹی گاڑیوں میں کوئی نا کوئی کام نکال کر ہی وہاں سے نکلنے دیتے ہیں___

لیکن ظاہر ہے کہ ان تمام رکاوٹوں کا پیرودہائی کی تاریخی مسلمہ اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، چنانچہ ہم بھی اس خصوصیت کا احترام نہایت استقامت سے کرتے چلے آرہے ہیں۔

دو۔۔۔چار ہو گئے

اس جولائی میں شمالی علاقہ جات کے جنون نے ہمیں ایک ایسے سفر پر اکسایا جس کی خواہش دنیا کے ہر ٹریکر اور کوہ نورد کی حسین ترین تمنا ہے___

بلندیوں کی چاہت رکھنے والا ہر ایڈونچرسٹ___ایک خواب ضرور دیکھتا ہے!

کنکورڈیا میں___پانچ گلیشیروں کے عین ملاپ پر___دنیا کی بلند ترین چوٹیوں کے قدموں میں___'پہاڑوں کے پہاڑ' کے ٹو___کے عین سامنے زندگی کا صرف ایک دن گزارنے کا خواب!

'پہاڑوں کے دیوتاؤں کی سرزمین' کے نام سے دنیا بھر میں مشہور اس مقام تک پہنچنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔اس سفر میں حادثات کے باعث جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے والوں کی بھی کمی نہیں۔کئی دن نہایت دشوار گزار علاقوں سے ہوتے ہوئے___انسانی آبادی سے بہت دور اور ہر لمحہ بدلتے موسموں میں پیدل سفر___لینڈ سلائیڈنگ___برفانی طوفان___لڑھکتے تودے اور پوشیدہ کھائیاں___بلندی کے اثرات اور ڈی ہائیڈریشن جیسے مسائل اور خطرات دنیا کے ان حسین ترین مناظر کے درمیان حائل ہیں۔

ان تمام مشکلات کو جاننے کے بعد بھی دل کنکورڈیا کی ہی تمنا کر رہا تھا۔یہ مہم سخت بھی تھی، لمبی بھی اور مہنگی بھی۔لیکن یہی خیال آتا تھا کہ چلو تو سہی، کنکورڈیا نا بھی پہنچے تو کیا۔۔یہ تو کہہ سکیں گے نا کہ ہم نے کنکورڈیا کی طرف سفر تو کیا تھا!

لیکن یہ بات آپ کتنے لوگوں کو سمجھا سکتے ہیں؟

یہی وجہ تھی کہ___اس ٹریک کے لئے ٹیم کی تیاری ہمیشہ سے زیادہ مشکل تھی۔

اپنی ٹریکنگ لائف کے آغاز سے لیکر اب تک ہماری ٹیم میں بہت سی تبدیلیاں آچکی ہیں۔آغاز کے آسان اور

نسبتاً کم بلند مقامات کے لئے ممبران کی تعداد ایک درجن تک بھی رہی۔ لیکن جوں جوں شوق نے ترقی ___ اور معلومات نے قراقرم اور ہمالیہ کے نہایت دشوار اندرونی علاقوں تک رسائی حاصل کی ___ ہماری ٹیم میں اتنی ہی کمی واقع ہوتی گئی۔

اب حالات یہ ہیں کہ ___ مقامی دوستوں میں سے ایک یاسر مغل کے سوا بلندیوں کے اس سفر پر بخوشی کوئی بھی تیار نہیں ہوتا۔ بعض شوقین سفر کی منصوبہ بندی کے آغاز میں تو نام لکھواتے ہیں ___ لیکن جوں جوں روانگی قریب آتی ہے ___ توں توں یہ حضرات بھی کم ہوتے چلے جاتے ہیں ___ اور روانگی کے وقت ایک مختصر سی جماعت دغابازوں کو طرح طرح کے القابات سے نوازتی اپنی راہ لیتی ہے۔

سیاحت کے اس شوق نے ہمیں جہاں اور بہت سی چیزوں سے نوازا وہاں بعض مخلص دوست بھی عطا کئے۔ اوکاڑہ سے تعلق رکھنے والے زاہد بھی ان میں سے ایک ہیں اور اکثر مہمات میں ہمارا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ کئی برس پیشتر مانسہرہ سے ناران جانے والی ایک ویگن میں ہونے والی یہ ملاقات آج دوستی کے ایک گہرے رشتے میں بدل چکی ہے ۔

زاہد صاحب اوکاڑا میں چاولوں کے کاروبار سے منسلک ہیں اور اندرون و بیرون ملک سیاحت کا گہرا شوق رکھتے ہیں۔

یاسر سے جب ٹیم کے دیگر ممبران کے حوالے سے بات ہوئی تو زاہد کا خیال سب سے پہلے ذہن میں آیا۔ فوراً فون کیا گیا۔

" بھئی تیار ہو جاؤ ___ کنکورڈیا کا پروگرام بن گیا ہے!" میں نے نہایت جوش وخروش سے زاہد کو آگاہ کیا۔

"اور ہاں ___ کوئی جاگنگ یا واک وغیرہ شروع کر دو فوراً! ___ یہ کوئی عام ٹریک نہیں" زاہد کا وزنی سراپا ذہن میں آتے ہی میں نے یہ مشورہ دینا بھی ضروری سمجھا۔

"یار ___ آپاں مشکل ای جاؤ ایدکی" (یار میں مشکل ہی جا سکوں گا اس دفعہ)۔ ٹھیٹھ پنجابی لہجے اور زبان والے زاہد نے سیدھا سا جواب دے دیا۔

" کیوں؟ خیر تو ہے؟ ___ کنکورڈیا جانے کی باتیں تو بہت کرتے تھے ___ اب کیا ہوا؟" ___ ایک یقینی ساتھی کے مایوس کن جواب نے تو تراہ ہی نکال دیا۔

"بس یار دعا کرو۔ کم بڑے نے فیر کدی دساں گا۔" (بس یار دعا کرو بہت سارے کام ہیں پھر کبھی بتاؤں گا) زاہد پٹڑی سے اترا ہوا ہی نہیں ___ بلکہ ہوائی جہاز پہ سوار تھا ___ اور کسی ڈھب پہ نہیں آ رہا تھا۔

تشویش کی بات یہ تھی کہ پہلے کبھی اس نے ایسا جواب نہیں دیا تھا بلکہ حامی فوراً بھر لیتا تھا ___ اور اگر کوئی نہایت ضروری مسئلہ پیش آ جائے تو آخر میں نہایت معذرت اور حسرت سے انکار کیا کرتا تھا ___ مگر اس دفعہ تو آغاز ہی سے 'نا' تھی۔ اس کے بعد بھی کئی طویل ٹیلیفون کالوں کے باوجود زاہد ___ کاروباری اور گھریلو مسائل کا بتا کر انکار ہی کرتا رہا ___

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے، بلکہ اب تو تنے بھی ___

یعنی ابھی ہماری ٹیم دو ممبران پر ہی مشتمل تھی ___ اور مزید ارکان کا امکان بھی کم ہی تھا۔

ایک ممبر کو تیار کرنے کے لئے جتنی مارکیٹنگ کرنا پڑتی ہے ___ جتنا زور بیاں استعمال میں لانا پڑتا ہے ___ گلگت بلتستان کا حسن جس طرح بیان کرنا پڑتا ہے ___ وہ نا پوچھئے۔

کبھی کبھار تو ایسا ہوتا ہے کہ کوئی صاحب سنی سنائی باتوں یا کسی ٹی وی ڈاکومنٹری سے متاثر ہو کر ___ وقتی جذبے کے تحت نسبتاً آمادہ بھی ہو جائیں تو ہماری کسی متاثر کن بات سے خوفزدہ ہو کر اپنے ارادے سے تائب ہو جاتے ہیں۔ وقت، اخراجات، پیشہ ورانہ مسائل اور گھریلو ذمہ داریوں سے نکلنے کے علاوہ مسلسل کئی دن تک سارا دن چلنا ___ اور رات کو کبھی پتھروں اور کبھی برفوں پر سونے کا تصور ___ کسی کسی کے لئے ہی رومانوی حیثیت رکھتا ہے۔ گھسے پٹے روزمرہ کے معمولات کے اسیر اور سہل پسند طبیعتیں ٹی وی، کمپیوٹر اور موبائل فون کے علاوہ کسی تفریح کی طرف آسانی سے مائل نہیں ہوتیں۔

البتہ جنت نظیر وادیوں ___ شفاف چشموں اور ندیوں ___ دنیا کی بلند ترین برف پوش چوٹیوں اور حیرت انگیز گلیشیئروں کی تصویریں تمام دوست ایک دوسرے سے چھین چھین کر دیکھتے اور دوسروں کو دکھاتے ضرور ہیں۔

یاسر سے مشورے کے بعد جولائی کے وسط میں سکردو کے لئے روانگی کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ بعض دوستوں نے 'کوشش کریں گے' کا کہہ رکھا تھا لیکن ہر بار پوچھنے پر ٹال مٹول کی باتیں ہی سننے کو مل رہی تھیں۔ تاریخ مقررہ سے چند روز پہلے تک معلوم یہی ہوتا تھا کہ میں اور یاسر ہی جائیں گے۔ برسوں کے تجربے نے یہ بات ہم پر واضح کر دی ہے ___ کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں ___ اور جو ہامی بھرتے ہیں وہ پوری کرتے نہیں! ___

چنانچہ جن چند حضرات نے پہلے سے امید دلا رکھی تھی آخر میں وہ خود بھی مسائل کا شکار ہوتے اور ہمیں بھی پریشان کرتے چلے گئے۔

یاسر کا کہنا تھا کہ ہمیں بات سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے___ 'کوشش کریں گے' کا مطلب تھا کہ کوشش کریں گے کہ تم بھی نا جا سکو!

لیکن ہماری مستقل پروپیگنڈہ مہم کا ایک فائدہ ہو ہی گیا۔ ایک دن ایک دوست شیخ صاحب کا فون آیا جو ہمارے ساتھ کچھ علاقے دیکھے ہوئے تھے۔

"سنا ہے جی اس دفعہ لمبا ہی پروگرام ہے___ تھرون روم آف دی ماؤنٹین گاڈز کا پلان ہے ___ جا کون کون رہا ہے؟" شیخ صاحب نے اپنی انگریزی کا رعب ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"شیخ صاحب___ آپ اپنا پروگرام بتائیں ابھی ٹیم فائنل نہیں ہوئی___ اور اس دفعہ کا ٹریک مس کرنے والا ہرگز نہیں!" میں نے ایک متوقع ٹیم ممبر کی امید پر فوراً جواب دیا۔

" کوشش کر تو رہا ہوں___ لیکن آفس سے چھٹی ملنی بہت مشکل ہے___ ایک دو پراجیکٹس ایسے چل رہے ہیں کہ بہت کم چانسز ہیں___ لیکن میرے ایک دوست ہیں___ وہ ٹریکنگ کا بہت شوق بھی رکھتے ہیں اور تجربہ بھی___ ان سے آپ کے ارادوں کا ذکر ہوا اور اب وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں___ کب ملاقات کریں؟" شیخ صاحب نے امید افزا سوال پوچھا۔

"جب آپ چاہیں___ دفتر کے بعد جہاں اور جب مرضی ملاقات کر لیتے ہیں" میں نے کہا۔

"چلیں___ میں ایسا کرتا ہوں کہ___ آپ کا فون نمبر انہیں دے دیتا ہوں___ وہ آپ سے رابطہ کر لیں گے ___ پھر جیسے مناسب سمجھیں ملاقات کر لیں___ ان کا نام عظیم ہے اور___ وہ بہت ایکسائٹڈ ہیں" شیخ صاحب کا جواب خاصہ حوصلہ افزا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میرے موبائل پر عظیم صاحب کی کال آ گئی۔

"اطہر صاحب___ میرا خیال ہے کہ آپ نے روانگی کی جو تاریخ طے کی ہے اس سے چند دن بعد روانہ ہوا جائے ___" عظیم نے دعا سلام کے بعد فوراً ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔

"لیکن اب تو کافی تیاریاں ہو چکی ہیں___ عظیم صاحب، آپ کسی خاص وجہ سے یہ بات کہہ رہے ہیں؟"

"جی اطہر صاحب___ دیکھیں میں نے چاند کی تاریخوں کا اندازہ لگایا ہے اور اگر ہم___ اپنے موجودہ پروگرام کے مطابق چلیں اور بغیر رکاوٹ شیڈول کے مطابق کنکورڈیا پہنچیں تو وہ چاند کی گیارہ تاریخ ہوگی___ آپ کو تو پتہ ہے کہ کنکورڈیا میں چودھویں کی رات کیا منظر پیش کرتی ہے" عظیم نے کسی ملاقات اور انٹرویو کے بغیر ہی اپنے تجربے ___ سمجھ اور___ سچے حسن پرست ہونے کا ثبوت ایک ہی جملے میں پیش کر دیا۔

کنکورڈیا ایسی جگہ ہے___ جہاں چاروں طرف سفید برف پوش چوٹیاں اور___ ہر طرف سے اترتے چھوٹے بڑے گلیشیئر دھوپ میں اس قدر چمک دار ہوتے ہیں کہ بغیر سیاہ چشمے کے ان کی طرف دیکھا نہیں جاتا۔ اور اگر دیکھیں تو سنو بلائینڈنیس کا خطرہ ہوتا ہے___

لیکن چاندنی راتوں میں بالخصوص چودھویں کی رات کے ٹو کے سامنے، کنکورڈیا دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس سے زیادہ خوبصورت چاندنی رات کا کوئی منظر کسی بھی مقام پر میسر نہیں آ سکتا___ شرط صرف اتنی ہے کہ آپ قسمت کے سکندر ہوں اور سال کے زیادہ تر دن ابر آلود رہنے والے علاقے کا موسم صاف ہو۔

موسم کا معاملہ تو اللہ پاک کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں اور___ ان علاقوں میں تو پانچ منٹ کی بھی پیشن گوئی نہیں کی جا سکتی___ لیکن ایک امید پر ایسے بے مثال منظر کے لئے دو دن کا التوا کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا۔ لہٰذا فوراً پروگرام میں دو دن کی تاخیر کا فیصلہ کر لیا گیا۔

اب ہم دو سے تین ہو چکے تھے___

فون پر اس گفتگو کے بعد عظیم سے مسلسل رابطہ اور ملاقات رہی اور بہت سے اہم معاملات میں عظیم نے بہت مدد کی۔

روانگی سے چار پانچ دن پہلے میں نے زاہد کو اپنے سٹل کیمرے کے لئے فون کیا۔ کسی وجہ سے زاہد کو کیمرے کی ضرورت تھی۔ کیمرہ میرے پاس بیکار پڑا رہتا تھا اس لئے کئی دن سے زاہد کے پاس تھا اور اب تک میرے ذہن میں کیمرے کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ زاہد سے کئی روز پہلے بات ہوئی تھی اور اس کے پیہم انکار کے بعد ٹریک کے معاملے پر بات کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ اب سامان کا جائزہ لینے پر کیمرہ یاد آیا تو فون کیا اور کیمرہ فوراً پارسل کرنے کی تاکید کی۔

اس مرتبہ زاہد پریشان سا ہو گیا۔

"اوہ یار کیا واقعی___ تم دونوں ہی جا رہے ہو؟ کیمرہ کیا کرنا ہے؟ کتنے لوگ ہو تم ؟"

پروگرام بننے سے لے کر اب تک کئی کوششوں کے بعد ہم اندازہ کر چکے تھے کہ زاہد کو کوئی بڑی مجبوری لاحق ہے۔ اس لئے اب ہم نے اصرار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ آخری گفتگو میں زاہد کو یہی کہا گیا تھا کہ اگر کوئی اور نہ بھی گیا تو میں اور یاسر ہی چلے جائیں گے___ تم سب جاؤ بھاڑ میں۔

یقیناً زاہد نے ہماری بات کو ایک جذباتی حربہ ہی سمجھا ہوگا۔ لیکن خلاف توقع ہماری ہر حال میں روانگی کے ارادے نے اسے کہیں اندر سے ہلایا تھا۔

کیمرہ مجھے ایک کورئیر کمپنی کے ذریعے اگلے دن ہی پہنچ گیا۔ میں نے شکریہ ادا کرنے کے لئے پھر فون کیا۔ کچھ دیر بات ہوتی رہی اور اندازہ ہوا کہ

آگ ہے دونوں طرف برابر لگی ہوئی!

اور پھر زاہد اوکاڑوی جوڑیک پر نا جانے کا تہیہ کئے بیٹھے تھے آخری رات یاسر کی طرف تشریف لے آئے۔ ایک سچے ٹریکر کے دل میں رقابت بھی بہت ہوتی ہے۔ حسن بے پرواہ کا___ بے نقاب دیدار عام ہو___ رقیب ہوں___ اور وہ نا ہو!

اب زاہد کے آنے سے چار افراد پر مشتمل ایک نسبتاً باوقار ٹیم کی تشکیل ممکن ہو چکی تھی جس سے ہم کچھ باعزت طریقے سے اپنی مہم پر روانہ ہونے کے قابل ہو گئے۔ ذہن نے ایک بہت چھوٹی ٹیم کی صورت میں سفر کی حقیقت کو قبول کر لیا تھا۔

کئی دن پہاڑوں کے اندر گزارنے کے لئے بہت سی خریداری بھی کرنی تھی۔ لیکن سامان کی خریداری کے لئے بھی ممبران کی تعداد کا متعین ہونا لازمی ہے۔ اس لئے یہ خریداری بھی بالکل آخری وقت پر کر سکے۔ افراتفری میں تمام خریداری ممکن نا تھی اس لئے صرف نہایت ضروری سامان اکٹھا کر لیا گیا۔

مناسب قیمتوں پر خریداری کے لئے ہول سیل کی دوکانیں ہی موزوں ہوا کرتی ہیں۔ گزشتہ تجربات کی بنا پر راولپنڈی اور اسلام آباد کی ایسی ہی دوکانوں سے استفادہ کیا گیا۔

عظیم صاحب نے بھی اپنی واقفیت کی بنیاد پر بعض معاملات میں بہت سہولت پیدا کی۔ ڈبہ بند خوراک وغیرہ عظیم نے اسلام آباد کے کسی سٹور سے حاصل کیں۔ چند ضروری اشیاء مثلاً کیروسین سٹوو، ہلکے وزن کے برتن، پورٹروں

کے لئے پلاسٹک کی چادریں، سامان کے لئے مضبوط رک سیک وغیرہ یاسر نے مہیا کر ڈالے___ آخری دن خوراک سے متعلق کچھ خریداری مزید کی گئی اور اسی شام ہم نیٹکو کی بس سے سکردو روانگی کے لئے تیاری کی حالت میں آ گئے۔

طے یہ پایا تھا کہ سکردو پہنچ کر اہم ترین کام یعنی پورٹرز کے بندوبست کے بعد جن چیزوں کی کمی محسوس ہو وہیں بازار سے خرید لی جائیں___ اس طرح ہم زیادہ سامان اٹھانے سے بھی بچ جائیں گے اور بے اندازہ خریداری سے بھی___

آبادیوں سے بہت دور، موسموں کے رحم و کرم پر اور کسی بھی ممکنہ و غیر ممکنہ صورتحال میں کسی معمولی چیز کی ضرورت بھی آپ کو بے بس کر سکتی ہے___ اسی طرح ایک لمبے دشوار گزار اور پیدل سفر میں بہت زیادہ وزن اٹھا کر چلنا بھی ممکن نہیں___

مکمل اندازے اور ٹریک کی معلومات کے مطابق مطلوبہ سامان کا انتخاب ٹریکنگ کا ایک اہم جزو ہے۔

کنکورڈیا جیسے ٹریک کے لئے جو سامان آپ کو لے جانا پڑتا ہے___ اگر کسی ناواقف شخص کو اس کا اندازہ فراہم کیا جائے تو وہ آپ کو کھسکا ہوا ہی سمجھے گا۔

پندرہ سے بیس دن کے اس سفر میں آپ نے اور آپ کے پورٹروں نے تین وقت کھانا ہے___ اور ظاہر ہے برتنوں میں پکانا اور کھانا ہے۔ خود کو گرم سرد سے بچانے کے لئے دونوں طرح کے لباس بھی ضرور ہی چاہئیں۔

تجربہ کار حضرات نے بتایا تھا کہ ایک ٹریکر کے لئے دو پورٹر ہوا کرتے ہیں جو پچیس کلوگرام تک کا وزن اٹھاتے ہیں___ عموماً یہ دو پورٹر فی ٹریکر کا رواج مغربی ممالک کے ان گوروں کے ہاں پایا جاتا ہے جو قراقرم کے خارزار جنوں میں بھی ہر ممکن آسائش کا بندوبست ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں امید تھی کہ کفایت شعاری اور مول تول کی اعلیٰ صلاحیتوں کی بدولت ہم تین چار پورٹروں کی مدد سے ہی یہ مہم طے کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ ایک امید ہی تھی اسے یقینی بندوبست نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ لہٰذا اصولی طور پر سامان اور اخراجات کا حساب لگانے کے لئے مروجہ طریقہ استعمال کرنا ضروری تھا۔

فی ٹریکر دو پورٹر کے حساب سے چار لوگوں کے لئے آٹھ پورٹروں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ملا کر کل ہو گئے بارہ!

___ بارہ آدمیوں کے تین وقت کا کھانا___ پندرہ سے بیس دن تک، کتنا بنا؟___

جتنا بھی بنا اب اس کھانے کے اجزائے ترکیبی کا حساب لگائیے___

آٹا، دال، چاول، چینی، دودھ، پتی، سبزیاں، نمک، مرچ مصالحے، ملٹی وٹامن مشروبات، گھی اور بہت کچھ!___

کسی معمولی پہاڑی بیماری یا فوری طبی امداد کی ضرورت کے پیش نظر ضروری ادویات وغیرہ___

ذاتی سامان میں گرم کپڑے، جیکٹ، دستانے، گرم ٹوپی، سلیپنگ بیگ، برفانی راتیں بسر کرنے کے لئے کیمپ اوریخ بستہ زمین پر بچھانے کے لئے میٹ___

پکانے اور کھانا گرم کرنے کے لئے سٹووا اور سٹوو کے لئے مٹی کا تیل، کیف، چولہے کی صفائی اور مرمت کی ضروری اشیاء اور ماچسیں وغیرہ!___

روشنی کے لئے موم بتیاں، رات کے گھپ اندھیرے اور منفی درجہ حرارت میں کسی بے چین کر ڈالنے والے تقاضے کے لئے ٹارچیں اور بیٹری سیل وغیرہ___

صفائی اپنی بھی اور سامان کی بھی کے لئے___ صابن، تولیہ، ٹوتھ برش، پیسٹ، سرف، تولیہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ اپنے اور پورٹروں کی ضروریات کی دیگر اشیاء بھی لسٹ میں شامل ہوسکتی ہیں اور اس طویل فہرست کے سامان کو بند کرنے اور اٹھانے کے لئے رک سیک، بیگ، پلاسٹک کے ڈرم وغیرہ!

جب ہم نے یہ سب کچھ کیلکولیٹ کیا تو گمان ہوا کہ شاید کسی فوجی رسد کا اندازہ لگالیا گیا ہے___

پھر حساب کیا___ پھر وہی___

پھر کیا___ پھر وہی___

چنانچہ متواتر کئی دن تک خریداری کے باوجود مزید سامان سکردو سے لینے کا فیصلہ اکثریت رائے سے منظور کرلیا گیا۔

روانگی اور سفر کی پہلی شام

جمعہ کا دن تھا۔ ناردرن ایریاز ٹرانسپورٹ کارپوریشن (نیٹکو) کی بس چار بجے سہ پہر روانہ ہونا تھی___

پروگرام کے مطابق سب لوگوں نے راولپنڈی میں یاسر کی طرف جمع ہوکر وہیں سے سفر پر نکلنا تھا۔ میں اور عظیم اسلام آباد سے اکٹھے ہی یاسر کی طرف آئے۔ زاہد بھی گزشتہ رات پہنچ چکا تھا۔

یاسر کا ڈرائنگ روم خوراک کے کسی گودام کا منظر پیش کر رہا تھا۔ خوراک کے ڈھیر کے ساتھ ہی سلیپنگ بیگ، ٹراؤزر، شرٹس، جیکٹیں اور طرح طرح کا سامان ڈھیر تھا۔ ایک طرف خالی رک سیک پڑے تھے جن میں ابھی اس سامان کو ٹھونسنا باقی تھا۔

زاہد کے چہرے پر بیزاری کے تاثرات تھے۔

''چلو، جلدی سے اپنے رک سیک خالی کردو، فوراً!'' یاسر نے ہمارے بیٹھنے سے پہلے ہی حکم جاری کردیا۔

''لیکن میں تو اپنی پیکنگ مکمل کر چکا ہوں اور بڑی دیر لگ جائے گی دوبارہ پیک کرتے ہوئے!'' عظیم پریشان ہو گیا۔

''یار بات یہ ہے کہ غیر ضروری سامان ہم یہاں چھوڑ کر جائیں گے۔ دیکھ رہے ہو نا یہ ڈھیر! کون اٹھائے گا یہ سب؟'' وزن اٹھانے کے خیال سے یاسر کے پیٹ میں ہول اٹھ رہے تھے۔

''اوہ جی، اسے سمجھاؤ۔ میرے تو سارے کپڑے نکال کر وہ پھینکے ہیں اس نے! کنکورڈیا جانا ہے وہاں ہر ملک کے لوگ ہوتے ہیں ذرا کپڑے تو صاف ہونے چاہئیں نا۔'' زاہد نے ایک زہریلی نظر یاسر پر ڈالی۔

زاہد کی بیزاری کی وجہ اب سمجھ آئی۔

''یہ دیکھو! سفید کاٹن کے جوڑے اس کے، لیدر کی جیکٹ اور موٹی جینز کی پینٹیں۔'' یاسر زور سے ہنسا۔ ''بیڈ شیٹ

سائز کا تو لیا دیکھو ذرا! کیا یہ سامان کنکورڈیا لے جانے والا ہے؟ اب میں سب کا سامان دیکھوں گا پھر فیصلہ ہوگا کہ کیا لے جانا ہے اور کیا نہیں!'' یاسر کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

میں نے اور عظیم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لیکن اب ہو بھی کیا ہو سکتا تھا۔ ہمارے بیگوں کی بھی تلاشی لی گئی۔

''اوئے! یار یہ شیونگ کٹ تو رہنے دو نا۔ سکردو میں شیو تو کرنی ہوگی۔''

''نائی سے کروالینا، بہت ہیں ادھر!''

''یہ تم ٹریکنگ کرنے جا رہے ہو یا امتحان کی تیاری کرنے؟ یہ کتاب اور اتنے سارے کاغذ کیا کرنے ہیں؟''

''اوئے یہ مت نکالنا۔ راستے کے نقشے ہیں اور کتاب سے کہیں معلومات کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ یہ ٹریکنگ گائیڈ لازمی ساتھ رکھنی ہے۔''

سامان کیا کھلا، ایک ہنگامہ ہی کھڑا ہو گیا۔

متعدد جھڑپوں کے بعد سامان کی چھانٹی ہوئی اور پھر پیکنگ۔۔ خوراک کا سامان سب سے زیادہ تھا جو ٹھونس ٹھانس کر دو جہازی سائز کے بیگوں میں آیا۔ برتن، چولہا اور اس نوعیت کی چیزیں بھی بمشکل دو بڑے بیگوں میں سما سکیں۔ ابھی بھی کچھ سامان باقی تھا جو مزید دو بیگوں میں بھر دیا گیا۔ ہمارے ذاتی سامان سے لبریز رک سیک ان کے علاوہ تھے۔

ہم دو بجے ٹیکسی کی تلاش میں نکلے__ سامان کے آٹھ عدد بڑے اور دو عدد کچھ چھوٹے بیگ ہمارے ساتھ تھے__ بہت سے ٹیکسی والوں نے تو یہی دیکھ کر دل چھوڑ دیا__ کسی نے روکا بھی تو پیرودہائی کا نام اس کی سماعت پر گراں گزرا__ خیر پون گھنٹے کی تگ و دو اور ٹیم ممبران کی مستقل مزاجی کی بدولت دو ٹیکسیاں نسبتاً مناسب کرائے پر حاصل کر ہی لی گئیں__

دو آدمی اور پانچ بیگ فی ٹیکسی لوڈ کئے گئے__ اور بیس منٹ میں پیرودہائی پہنچ کر ان لوڈ۔

اس غیر معمولی بڑے لاری اڈے میں پہنچ کر سخت گرمی اور حبس کا احساس ہو رہا تھا۔ سامان نیٹکو کے دفتر کی دیوار سے لگا کر ہم وقت گزاری کرنے لگے__

ہر طرف بسوں کی پیں پڑاں اور ڈیزل کے دھوئیں__ اڈے کے چاروں اطراف دکانوں میں طرح طرح کی

اشیاء کی بہتات__ جس میں اصلی مال کی پہچان ہر کسی کے بس کی بات ہی نہیں__ ہوٹلوں میں ٹی وی پر فلم دیکھنے والوں اور مکھیوں کا ہجوم__ وقت گزاری کے لئے کچھ دیر ادھر ادھر مٹر گشت کرنے کے بعد ہم واپس اپنے سامان کے پاس آ گئے۔

بس کی روانگی سے آدھا گھنٹہ پہلے سامان لوڈ کیا گیا۔ ہر بیگ کے ساتھ ایک مخصوص نمبر کا ٹیگ لگا کر اس کا آدھا حصہ ہمیں دیا گیا کہ سکردو پہنچ کر یہ ٹیگ دے کر اپنے بیگ لے لیں__ یہ طریقہ ہمیں اچھا لگا__ اس طرح مسافروں کا سامان بھول چوک سے ادھر ادھر ہونے کا امکان نہیں رہتا۔

پہلے سے بکنگ کروانے کی وجہ سے ہمیں بس کے اگلے حصے کی سیٹیں مل گئی تھیں__ یہاں سے سامنے کے شیشے اور پہلوؤں کی کھڑکیوں سے باہر کا نظارہ کرنے میں آسانی تھی__ آگے بیٹھنے کا یہ فائدہ بھی ہے کہ راستے میں جہاں کہیں بس رکے آپ آسانی سے نیچے اتر کر اپنی ضروریات پوری کر سکتے ہیں۔

مسافر ایک ایک کر کے سیٹیں تلاش کرتے ہوئے اپنی اپنی جگہ بیٹھ رہے تھے۔ جلد ہی تمام مسافر سوار ہو گئے اور ٹکٹ چیکنگ کا مرحلہ شروع ہوا۔ ان بسوں میں اکثریت ان مسافروں کی ہوتی ہے جو سکردو سے اسلام آباد بلکہ پورے پاکستان میں آتے ہیں اور واپس سکردو جا رہے ہوتے ہیں__ ان لوگوں میں سادگی بھی ہوتی ہے اور ان علاقوں کی بہت اچھی معلومات بھی مل جاتی ہیں__

اکثر ایسا ہوا کہ سفر شروع کرتے وقت ہمیں بہت سی ایسی جگہوں کی مکمل معلومات نہ ہوتی تھیں جو پہاڑوں میں بہت اندر اور دور دراز واقع ہیں__ لیکن کسی بس میں مقامی ہمسفروں نے ہمیں تفصیلی رہنمائی مہیا کی کہ فلاں جگہ سے اتنے بجے اس گاڑی میں بیٹھو یا فلاں علاقے کی جیپ اتنے پیسے مانگے گی لیکن اتنے مناسب ہوں گے وغیرہ۔

کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ لوگوں نے اپنے گھروں کے پتے بھی دیے کہ آپ واپسی پر ہمارے پاس بھی رہ کر جائیں__ مزید یہ کہ اپنے ایسے عزیز جو سیاحت کے پیشے سے وابستہ ہوں__ ان کے نام اور پتے تک سمجھانے کی کوشش کی کہ انہیں ہمارا بتائیں وہ آپ کی مکمل مدد کریں گے__

ہمارا تجربہ ہے کہ ان کی بتائی ہوئی باتوں نے ہمیں کم خرچ پر نہایت سہولت کے ساتھ گلگت بلتستان کی سیاحت میں بہت مدد دی۔ اتنی سادگی اور تواضع__ اعلیٰ ظرفی__ اخلاقی عظمت اور بے لوثی__ اپنے ہم وطنوں سے شدید محبت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

میں اور یاسر جبکہ ___ زاہد اور عظیم ٹکٹ پر لکھے سیٹ نمبروں کے مطابق بیٹھ گئے۔ طے یہ ہوا تھا کہ جب کوئی ممبر اپنے ہمسفر سے اکتا جائے، یعنی بہت ہی اکتا جائے تو سیٹیں بدل لیں گے۔

بس نے اپنا پہلا پڑاؤ مانسہرہ میں کرنا تھا ___ یہ کوئی تین یا ساڑھے تین گھنٹے کا فاصلہ ہے ___ عموماً یہ وقت مغرب کے بعد یا رات کا ہوا کرتا ہے جہاں سب کھانا وغیرہ کھا لیتے ہیں ___ اور اگلے چار گھنٹے تک کی تمام ضروریات کا بندوبست کر لیا کرتے ہیں۔ نماز یا کسی ضروری کام کے لئے کسی مناسب جگہ بس رکوائی جا سکتی ہے ___ لیکن نماز کے لئے تو سب ڈرائیور حضرات مکمل تعاون کرتے ہیں ___ لیکن دوسری ضروریات کے لئے خاصے پس و پیش سے کام لیتے ہیں ___ چاہے وہ ضرورت اپنی انتہا پر ہی کیوں نہ ہو!

ٹکٹ چیکنگ وغیرہ کے بعد بس کو روانگی کا سگنل دے دیا گیا۔ پیرودہائی کی مشہور زمانہ سڑک سے ہچکولے کھاتی ___ بلکہ تقریباً الٹی سیدھی ہوتی ___ ہماری بس آئی جے پرنسپل روڈ پر پہنچی اور یہاں سے روانی کے ساتھ جی ٹی روڈ اور نصف گھنٹے سے کچھ زائد وقت میں حسن ابدال سے داہنے ہاتھ مڑ کر شاہراہ قراقرم پر رواں دواں ہو گئی۔

حویلیاں کے بعد شام کے سائے گہرے ہونا شروع ہو گئے ___

سڑک کے کنارے گھر اور دکانیں اور ان کے پیچھے دور تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیت ___ جہاں کھیت ختم ہو رہے تھے وہاں سے سبز پہاڑوں کی لکیر شروع ہو رہی تھی۔ منظر مسحور کن تھا!

کچھ ہی دیر میں پہاڑی علاقے کا آغاز ہو گیا اور بس نے آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھنی شروع کر دی۔ بل کھاتی سڑک پر دونوں طرف درختوں نے اپنا رنگ بدلا ___ ڈھلوانوں پر سبزے کی تہہ اور تراوٹ گہری ہونا شروع ہوئی ___ اور بس کی کھڑکیوں سے اندر آتی ہواؤں نے گرمی سے جھلسے جسموں کو فرحت اور خنکی کا احساس دلانا شروع کیا۔

بائیں ہاتھ پر وقتاً فوقتاً گہری کھائیاں درختوں کے جھنڈ میں سے نظر آ رہی تھیں ___ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کھائیوں کے پیچھے کے پہاڑوں کی سرسبز چوٹیوں پر بھی اکا دکا مکان نظر آ رہے تھے ___ ان مکینوں کی ہمت پر بڑا رشک آیا ___ اتنی بلندی پر گھر بنانا ___ اور وہاں سے نیچے اتر کر دوبارہ اچھی خاصی چڑھائی چڑھ کر سڑک تک پہنچنا ___ اور پھر اسی طرح واپس جانا! ___ یقیناً ان لوگوں کے پاس کوئی ہیلی کاپٹر نہیں ہو گا اور کسی گاڑی کے ذریعے وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی بظاہر نظر نہیں آیا۔

بہت سے موڑ مڑ کر اور خاصی بلندی پر ایبٹ آباد کا آغاز ہو گیا ___

ہوٹل، مارکیٹیں، بسوں کا اڈہ اور گاڑیوں سے بھری سڑک سے آہستہ آہستہ گزرتے ایبٹ آباد کی رنگینیاں دیکھتے ہم مانسہرہ کی طرف چلتے رہے۔

ایبٹ آباد ہزارہ کا اہم ترین شہر ہے ___ یہاں پاکستان کے دیگر پہاڑی علاقوں کی نسبت ہر قسم کی جدید سہولیات موجود ہیں ___ قدرتی حسن سے مالا مال اس شہر میں گرمیوں کے موسم میں ہمیشہ سیاحوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے ___ ٹھنڈیانی، گلیات، الیاسی مسجد اور شملہ پہاڑی جیسے پرفضا اور مشہور مقامات ایبٹ آباد کی کشش میں کمی نہیں آنے دیتے۔

ہم اب ایوب میڈیکل کمپلیکس کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ سرسبز بلند پہاڑوں، صاف ستھری سڑکوں، ڈھلوانی چھتوں والے گھروں، دفتروں اور درختوں کا یہ منظر ہر زاویے سے حسین تر تھا۔ اور ایبٹ آباد کے انتہائی خوشگوار موسم میں سفر کی یہ پہلی شام نہایت دلفریب بنا دی تھی۔

ایبٹ آباد سے مانسہرہ کا فاصلہ تقریباً پون گھنٹے کا ہے ___

جب ہم مانسہرہ کے مخصوص بس اڈے میں پہنچے تو شام ڈھل چکی تھی ___ آس پاس کے درختوں پر دن بھر کے تھکے ماندے پرندوں کی چہچہاہٹ ماحول پر چھائی ہوئی تھی اور فضا میں پھیلی خنکی وجود میں عجیب سا گداز پیدا کر رہی تھی۔ اڈے سے کچھ ہی پہلے شاہراہ قراقرم سے ایک سڑک دائیں طرف نکلی تھی۔ یہ سڑک بالاکوٹ سے ہوتی ہوئی کاغان اور ناران کی سمت جاتی تھی۔ شوگران، سری پائے، ملکہ پربت، سیف الملوک، لولوسر اور دودھی پت کی جھیلیں، لالہ زار اور بابوسر ٹاپ! یہاں سے چلاس تک دریائے کنہار کے ساتھ ساتھ سفر کیسے کیسے خوابناک مناظر کو ایک زنجیر میں باندھتا ہے۔

مسئلہ صرف یہ تھا کہ اب وہ سڑک پیچھے رہ چکی تھی اور ہم شاہراہ قراقرم پر تھے جو خود ایک عجوبہ ہے! اور ان گنت عجوبے ابھی اس شاہراہ سے دیکھنے کو ملنے تھے۔

ابھی کھانے کا وقت نہیں ہوا تھا اس لئے قریبی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا گیا۔ میں نے سوچا کہ اگلے پڑاؤ تک رات کافی ہو جائے گی ___ لہٰذا کوئی ہلکی پھلکی چیز چائے کے ساتھ کھا لینی چاہئے ___

میں اپنی جگہ سے اٹھا ہی تھا کہ یاسر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ___

"اگر سکٹ لے کر آئے تو میں یہیں سے دوسری بس پکڑ کر واپس چلا جاؤں گا!!"

ہر سفر میں ساتھ رہ کر یاسر میری عادات سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب آپ کئی دنوں کے ٹریک پر نکلتے ہیں تو بحیثیت لیڈر آپ کو بہت ساری چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے___ بجٹ ان' بہت ساری 'چیزوں میں سب سے اہم ہے___ ایسا نہ ہو کہ آپ جب ٹریک سے واپس آ رہے ہوں، سکردو کے اڈے میں پہنچ کر معلوم ہو کہ کرایہ تو چار کے بجائے تین لوگوں کا باقی بچا ہے___ اور اب کسی ایک کو دریائے سندھ کے راستے آنا ہوگا___

طریقہ دلچسپ ہو سکتا ہے، لیکن کپڑے بھیگنے کے خیال سے کوئی تیار ہونا ہو۔ اس لئے جگہ جگہ پیسے خرچ کرتے ہوئے بہت احتیاط اور ایک باقاعدہ حساب کے تحت چلنا پڑتا ہے___ اس لئے میں کبھی کبھی یہ کوشش کرتا ہوں کہ کسی جگہ اگر کھانے کے بجائے چائے بسکٹ یا سنیکس وغیرہ سے گزارا چلایا جا سکتا ہو تو بہت مناسب بات ہے___ اور یاسر میری اس مجبوری کو سمجھنے کے باوجود اسے میری کمزوری بنانے پر تلا رہتا ہے۔

میں ہوٹل سے باہر آیا۔ ایک طرف ریڑھی پر سموسے اور پکوڑے بک رہے تھے۔ چار سموسے لئے، واپس آیا اور سب کے سامنے میز پر رکھ دیئے۔

''میرے دوست! ناراضگی کی کیا بات ہے؟ تمہیں بسکٹ نہیں پسند تو نہ سہی۔ مانسہرہ کے لوگ اتنے بے مروت نہیں کہ مہمانوں کی تواضع بھی نہ کر سکیں!''

دو ڈبے بسکٹوں کی نسبت چار سموسوں کی خریداری سے چند روپوں کی مزید بچت ہو گئی تھی___ لیکن مجھے یقین تھا کہ اگلے پڑاؤ تک یاسر کا ذہن کسی انتقامی منصوبے کا نقشہ تیار کر چکا ہوگا۔ اس لئے میں رات کے کھانے پر آنے والے اخراجات کا اندازہ لگانے لگا۔

یہ ناممکن تھا کہ ایک لمبے وقفے اور سفر کے بعد کھانے کا بھی ایک طویل دور نہ چلے۔

چاندنی رات اور دریائے سندھ

یکا یک مانسہرہ کی پرسکون فضا میں ایک بھونچال پیدا ہوا اور کرسیوں اور چارپائیوں پر براجمان مسافروں میں ہڑبونگ مچ گئی___

بعض حضرات بس کی جانب جب کہ کچھ مخالف سمت میں دوڑے۔ ہوٹل کے باہر کھڑی ہماری بس کے ڈرائیور نے مقررہ وقت سے پہلے ہی بے تابی اور بے باکی کے ساتھ کرخت صوت ہارن پر کوئی دھن بجانے کی کوشش کی جو اصل میں کوچ کا نقارہ تھا___

بہت سے مسافروں کے ساتھ ہم نے بھی انتہائی فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا اور فوراً جا کر اپنی اپنی سیٹوں پر دبک گئے۔ لیکن چند حضرات نے اپنی' گونا گوں' ضروریات کے تحت بس ڈرائیور کی وارننگ کو نظر انداز کیا اور بس بھرتے بھرتے مزید دس منٹ لگ ہی گئے۔

اندھیرے کی چادر نے دور دور تک کے پہاڑی مناظر کو اگلی صبح تک محفوظ اور تروتازہ رکھنے کے لئے اپنے حصار میں لے لیا تھا___ اور اب بس کی کھلی کھڑکیوں سے داخل ہونے والی ہوائیں سردیوں کی یاد دلا رہی تھیں۔ بعض لوگوں نے اپنی کھڑکیوں کے شیشے بند کرنا شروع کر دیئے۔

اگلا پڑاؤ اب چھترپلین یا بشام جا کر ہونا تھا۔ میری خواہش تھی کہ بس اب چھترپلین میں رکے___

چھترپلین ایسی جگہ ہے جسے آپ ایک بلند درہ کہہ سکتے ہیں۔ حویلیاں کے بعد شروع ہونے والی چڑھائی چھترپلین تک چلتی ہے اور اس کے بعد دریائے سندھ کے آغاز یعنی تھاکوٹ تک ایک لمبی بل کھاتی اترائی ہے___ چھترپلین خاصی بلندی پر واقع حیرت انگیز طور پر ایک وسیع ہموار میدان ہے جس کی وجہ سے اسے پلین کہا جاتا ہے۔

یہاں پر غالباً ایک ہی ہوٹل ہے جو لکڑی سے بنایا گیا ہے۔ نہایت خوبصورت لکڑی کے کام کے علاوہ یہاں کا کھانا

بھی راستے کے دیگر ہوٹلوں سے بہتر اور خوش ذائقہ ہے___ اسی وجہ سے میری خواہش تھی کہ ہم کھانا چھتر پلین میں ہی کھائیں۔لیکن عموماً یہ فیصلہ بس ڈرائیور کی مرضی پر ہوتا ہے۔کبھی وہ یہاں بس روکتے ہیں،کبھی بشام تک چلتے رہتے ہیں۔

یہاں سے چھتر پلین کے لئے تقریباً دو گھنٹے کا سفر باقی تھا۔اگر ہم بشام جا کر رکے تو مزید ڈیڑھ دو گھنٹے کا انتظار کرنا پڑتا۔کچھ دیر سوچنے کے بعد مناسب یہی سمجھا کہ اٹھ کر ڈرائیور سے کنفرم کرلوں کہ اب بس کہاں رکے گی۔

پے در پے شدید موڑ مڑتی بس میں اٹھنا،سیٹوں کو پکڑ پکڑ کر چلنا اور پھر واپس آنا اچھا خاصا مشکل کام ہے۔خیر کسی نا کسی طرح ڈرائیور کے پاس پہنچا۔بس ڈرائیور نے ایک معصوم سی خواہش کو یہ کہہ کر حسرت بنا دیا بشام سے پہلے گاڑی کسی صورت نہیں روکی جاسکتی۔اس کہنا تھا کہ ہم پہلے ہی اپنے وقت سے لیٹ ہیں۔

اب کیا ہوسکتا تھا اس لئے واپس سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔بشام تک اب ایک طویل سفر تھا اور کسی نا کسی طرح یہ وقت تو گزارنا ہی تھا۔یہ وقت ہم نے گپ شپ میں گزارا۔مسافروں میں ایسے بھی تھے جو بے خبر سو رہے تھے۔کچھ اونگھ رہے تھے اور باقی ہماری طرح آپس میں وقت گزاری کی باتیں کر رہے تھے۔

یاسر اور مجھے دونوں کو ایسے سفر میں نیند نہیں آتی۔شاید رگوں میں دوڑتی سنسنی اس کی وجہ ہے۔وہ سنسنی جو آنے والے دنوں کے تصور سے پورے بدن پر طاری ہوجاتی ہے۔یا اس سفر کا اپنا ایک چارم ہے جو نیند پر حاوی ہوجایا کرتا ہے۔عام روز شب کے پرشور اور اعصاب پر مسلسل اثر انداز ہونے والے معاملات سے اکتائے ہوئے انسانوں کو جب چند دن ایسے ملیں جس میں وہ آزادی سے اپنی خوابناک خواہشات کی تکمیل کے لئے نکلے تو شاید ایسی کیفیت کسی پر بھی طاری ہوسکتی ہے۔قدرت کے جا بجا بچھائے ہوئے دنیا کے حسین ترین نظاروں کا تصور شاید انسان کے اعصاب کو گہری نیند سے بھی زیادہ سکون دینے کی تاثیر رکھتا ہے۔

بات چلی نکلی پاکستان میں سیاحت کی۔یاسر کو ہمیشہ کی طرح اس بات کا غصہ تھا کہ ہمارے لوگ اپنے ہی ملک کے ان رنگین نظاروں اور دنیا کے معروف ترین علاقوں کی طرف کیوں نہیں نکلتے۔لاکھوں روپے خرچ کر کے یورپ اور امریکا کے چکر لگانا تو ہمارے لئے سٹیٹس سمبل ہے،لیکن امریکا اور یورپ کے لئے جو علاقے خواب کی حیثیت رکھتے ہیں ہم نہایت قریب ہو کر بھی یہاں اپنا وقت اور چند ہزار روپے لگانے کے روادار نہیں۔جس ٹریک پر بھی جاؤ گورے نظر آئیں گے یا جاپانی۔ہم ہیں ہی سستی کے مارے لوگ۔پیدل چلنے کے نام سے تو موت آتی ہے۔

وہ پتہ نہیں کیا کیا کہتا رہا۔۔

میں خاموشی سے ہوں ہاں کی صورت میں جواب دینے کے سوا کیا کہتا۔بات اس کی ٹھیک تھی۔ہمارے ہاں سیاحت کو فضول مشاغل میں ہی شمار کیا جاتا ہے۔وقت اور پیسے کا زیاں۔تفریح کا نظریہ لوگوں کی اکثریت کے لئے نہایت محدود مفہوم رکھتا ہے۔عوامی شعور کے فقدان کے علاوہ مسئلہ سیاحت کے فروغ کے لئے کوششوں کا بھی ہے۔حکومتی سطح پر سیاحت کی ترقی اور سہولیات کی خاطر کی جانے والی کوششیں نہایت ناکافی ہیں۔سوائے مختلف دعووں اور سیمینارز کے کوئی انقلابی عملی قدم کسی بھی جگہ دیکھنے میں نہیں آیا۔

غیر ملکی سیاحوں کی شمالی علاقوں میں دلچسپی ہماری کوششوں سے زیادہ ان کی اپنی معلومات کی وجہ سے ہے۔ان کے ہاں کھیلوں اور دیگر جسمانی اور غیر نصابی سرگرمیوں کے لئے باقاعدہ ادارے ہیں۔کلائمبنگ، کیمپنگ، راک کلائمبگ، ایڈونچر سپورٹس اور نت نئے انداز کے مشاغل کو وہاں پیشوں کا درجہ حاصل ہے۔حکومتیں اور نجی ادارے لوگوں کے جذبے اور شوق کی قدر کرتے ہیں اور اپنی پبلسٹی کے لئے ہی سہی، مالی معاونت تک سے بھی گریز نہیں کرتے۔

ہمارے ہاں شوق ہے، جذبہ ہے لیکن مواقع نہیں ہیں۔وسائل کے بغیر ہم نے نذیر صابر، اشرف امان اور روزی علی جیسے کوہ نورد پیدا کئے۔ان جیسے مزید سینکڑوں کلائمبرز بہت کم کوشش سے عالمی سطح پر اپنا لوہا منوانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔یہ سب ٹیلنٹ ہے جو قدرت نے ہمارے لوگوں کو دیا ہے۔لیکن یہ ٹیلنٹ پچیس کلو وزن اٹھانے اور زیادہ سے زیادہ گائیڈ بن کر چند ہزار روپے کی فکر میں گھل جاتا ہے۔

کئی سوچیں تھیں جو ذہن میں آتی تھیں۔مسائل بھی ہیں اور ان کا حل بھی۔مشکل صرف یہ ہے کہ حل کرنے کی طاقت رکھنے والے پیدل چلنے کا شوق ہی نہیں رکھتے!

انہی باتوں اور سوچوں کے دوران اچانک یہ احساس ہوا کہ جب بس کسی آبادی میں سے گزرتی ہے تو ہمارے بائیں جانب گہرائی میں لمبی تھرتھراتی روشنی کی لکیریں بھی چلنا شروع ہوجاتی ہیں۔روشنی کی یہ تھرتھراتی لہریں دکانوں اور مکانوں پر لگے بلبوں کا عکس تھا جو درختوں کے پار کسی پانی میں نظر آتا تھا۔یقیناً یہ دریائے سندھ کا آغاز تھا جو یہیں کہیں پہاڑوں کے پیچھے بل کھاتا ہوا تربیلہ ڈیم کی طرف جا رہا تھا۔

اب کچھ ہی دیر کے بعد تھا کوٹ کا پل ہزارہ ڈویژن کے اختتام کا اعلان کرے گا اور ہم بشام کی حدود میں داخل ہو

جائیں گے۔

یاسر اور میں دونوں ہی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ دریائے سندھ کا آغاز ہوتے ہی ہماری تمام توجہ اسی کی طرف ہو جایا کرتی ہے۔ جلد ہی اکا دکا جلتے بلب ایک روشن بازار میں بدل گئے۔ یہ بازار تھاکوٹ کا تھا۔ تھاکوٹ کے مقام پر دریائے سندھ کوہستان کے پہاڑوں میں سے نکلتا، بل کھاتا شاہراہ قراقرم کی دوسری سمت آ جاتا ہے۔ ایک عظیم پل دریا کے اوپر سے گاڑیوں کی آمدورفت کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔

پل شروع ہونے سے پہلے کچھ دیر کے لئے بس رکی۔ پل پر سامنے سے ایک ٹرک آ رہا تھا۔ دریائے سندھ پر قائم کئے گئے تمام پلوں پر ایک وقت میں ایک بڑی گاڑی کو چلنے کی اجازت ہے۔ ٹرک کے اس طرف آتے ہی ہماری بس پل پر چل پڑی۔

پل پر سے یہ جاننے کے باوجود کہ اندھیرے میں اس عظیم دریا کا نظارہ نہ ہو سکے گا، ہم نہایت ذوق وشوق سے کھڑکیوں سے تقریباً باہر نکل نکل کر دیکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ نیچے کچھ گہرائی میں پل پر لگے اکا دکا بلبوں کی روشنی کا عکس تو نظر آیا لیکن یہ نہیں پتا چل سکا کہ دریا میں پانی کتنا ہے۔ یہ اب پو پھٹنے کے بعد ہی معلوم ہونا تھا۔

اپنے چند تجربات کے بعد ہم دریا کی سطح اور روانی سے اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ گزشتہ دنوں گلیشئروں والے علاقوں میں موسم کیسا رہا۔ بادلوں کے چھائے رہنے کے باعث چونکہ برف کا پگھلاؤ کم ہو جاتا ہے اس لئے دریا میں پانی کا بہاؤ بھی نسبتاً کم ہوتا ہے جبکہ موسم صاف ہونے کی صورت میں دریا کی روانی دیکھنے والے پر حقیقتاً ہیبت طاری کر دیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موسم کا حال جاننے کے لئے یہ پیمانہ خاصا ناقابل اعتبار ہے لیکن دل کے بہلانے کو یہ خیال اچھا ہے!

پل پار کرنے کے بعد چند ہی لمحات میں بشام سے ملحقہ متفرق آبادیوں کا آغاز ہو گیا۔ بیس پچیس منٹ میں بس بشام کے مشہور بازار میں داخل ہو گئی۔

بشام ضلع سوات کا مشہور اور اہم حصہ ہے جو عین شاہراہ قراقرم پر واقع ہے۔ یہاں سے سوات کے حسین اور معروف حصوں تک شانگلہ پاس کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے۔ شانگلہ پاس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انتہائی بلند اور خوبصورت راستہ ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

بس کے رکتے ہی تمام مسافروں نے ایک ساتھ بس سے اترنے کی کوشش کی۔ مانسہرہ سے لے کر اب تک ایک

لمبے سفر کے دوران مسافروں کی نجانے کون کون سی ضروریات اپنے عروج کو پہنچ چکی تھیں۔ ہم نے حیرت انگیز تحمل کا مظاہرہ کیا اور سب سے آخر میں بس سے اترے۔ حالانکہ کئی مرتبہ دل کیا کہ کھڑکی سے باہر کود کر سب سے پہلے کسی واش روم پر قبضہ کر لوں۔ کئی گھنٹوں سے درختوں کے طویل سلسلے اور رات کی ٹھنڈی ہواؤں نے آخر کچھ تو اپنا اثر دکھانا ہی تھا۔

بالآخر ایک سرائے نما ہوٹل میں بچھی بان کی چارپائیوں پر ہم چاروں ڈھیر ہو گئے۔ سیٹوں پر بیٹھے بیٹھے کمر اکڑی اکڑی سے محسوس ہو رہی تھی۔

"شاہ جی اج کوئی بسکٹ نئیں؟" بہت دیر بعد زاہد کی آواز آئی۔

مجھے تھکاوٹ اور بھوک کے اس عالم میں ایسی بے محل بات پر طیش تو بہت آیا لیکن اپنے اس ہتھیار کو میں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا خاصی ڈھٹائی کے ساتھ آہستہ آہستہ سیدھا ہوا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''پوچھتے ہیں کسی سے کیا کیا ہے کھانے میں۔''

ایک ویٹر جو مخصوص سواتی حلیے میں نہایت پھرتی سے مختلف چارپائیوں پر بیٹھے مسافروں کو بھنڈی کی پلیٹیں تھما رہا تھا فوراً ہمارے پاس آیا اور بہت تیزی سے بولا۔

"بنڈی کائے گا یا گوشت؟"

بشام کے اس ہوٹل میں فکسڈ مینو کا رواج تھا۔ یعنی ایک دو کھانے پکتے تھے اور گاہکوں کو انہی کھانوں میں سے اپنی پسند کے انتخاب کا اختیار تھا۔

''خان صاب، یار کوئی مرغی مچھلی نہیں ہے؟'' یاسر نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔

''بھائی جان، بولا نا بنڈی ہے اور بڑا گوشت ہے۔ جلدی بولو کیا لائے؟'' خان صاحب کے جواب سے میرے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی جب کہ یاسر آہستگی سے دوبارہ لیٹ گیا۔

''پہلے سے دیکھ کر ہی ہوٹل میں گھسنا چاہئے!'' وہ بڑبڑایا۔

ہم نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور ایک گوشت اور تین پلیٹ بھنڈی پر متفق ہو گئے۔

خان صاحب کی طرف مڑے تو وہ ہال کے دوسرے سرے پر بھنڈی کی پلیٹیں بانٹتے نظر آئے۔ بڑی مشکل سے انہیں بلا کر اپنی درخواست پیش کی جو انہوں نے بمشکل تیس سیکنڈ کے اندر اندر کھانے کی پلیٹیں ہمارے سامنے پٹخ کر

پوری کردی۔

کھانے کی ترکیب بھی کوئی خاص تھی اور خاصی کوشش کے باوجود سمجھ نہیں آتا تھا کہ کھانے میں بھنڈی اور گوشت کا ذائقہ کیوں نہیں ہے؟

کھانے اور چائے کے بعد ہم نے بازار کی طرف توجہ کی۔

کسی قسم کی خریداری کا تو کوئی سوال نہ تھا۔لیکن بشام کے بازار میں دکانوں میں سجی رنگارنگ اشیاء اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔چین سے درآمد شدہ برتن، کمبل، ٹی وی، ٹیپ ریکارڈر، ڈی وی ڈی پلیئر، جوسر، چولہے اور ہر طرح کا سامان یہاں دستیاب ہے۔چائنا کی مصنوعات کے بعد جو چیز یہاں کی دکانوں میں بہتات میں ہے وہ اسلحہ ہے۔ مقامی روایات کے مطابق بندوقیں، ریوالور، پستول اور دیگر لوازمات شیشے کی الماریوں میں سجے ہیں۔کافی دیر تک سڑک کے دونوں طرف کی مختلف دکانوں کا جائزہ لیتے رہے۔

ابھی ہم بازار کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ ایک اطلاع ملی۔

عظیم جو پتہ نہیں کس وقت ہم سے علیحدہ ہوکر کہیں غائب ہوگیا تھا پریشان سی صورت لے کر نمودار ہوا۔

''آپ لوگ ادھر گھوم رہے ہیں۔میں بس کی طرف گیا تھا لیکن کنڈیکٹر کہہ رہا ہے کہ ابھی یہاں کافی دیر لگ جائے گی۔''

''کیوں؟ خیریت تو ہے؟ عموماً آدھے گھنٹے کا ریسٹ ہوتا ہے، دیر کیوں؟'' میرے لئے بھی یہ بات نئی تھی۔

''کنڈیکٹر کہتا ہے کہ پولیس کا حکم ہے۔رات آٹھ بجے کے بعد آنے والی گاڑیاں بشام میں رکیں گی اور رات کے بارہ بجے تمام گاڑیوں کو ایک کارواں کی شکل میں پولیس کی حفاظت میں چلاس تک پہنچایا جائے گا۔'' عظیم نے بتایا۔

''اچھا! تو پھر کہیں آرام نا کرلیں۔بڑا سفر کیا ہے بھئی۔ابھی اور بھی بہت ہے۔کیوں یاسر؟'' زاہد کو یہ خبر اچھی لگی۔

''کیا بس کو کندھے پر اٹھا کر لائے ہو یہاں تک؟ آرام کرلیں!'' یاسر تپ گیا۔''سکردو میں بھی کئی کام کرنے ہیں، دیر سے مسئلہ ہوگا ہمارے لئے۔''

''چلو ذرا تسلی سے معلوم تو کریں کیا یہ بات واقعی صحیح ہے۔'' مجھے بھی فکر ہوئی اور ہم اس پٹرول پمپ کی طرف چل پڑے جہاں ہماری بس کے علاوہ بھی چار پانچ گاڑیاں کھڑی نظر آرہی تھیں۔

ادھر ادھر سے معلومات لینے کے بعد پتہ چلا کہ امن وامان کے حوالے سے چند ناپسندیدہ واقعات کے بعد سفر کو

محفوظ بنانے کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔اب مقامی پولیس اور خصوصی ٹاسک فورس کی حفاظت میں گاڑیوں کا ایک کاروان بنا کر محفوظ علاقے تک پہنچایا جاتا ہے۔جہاں یہ بات تسلی کا باعث تھی کہ کسی خطرے سے بچاؤ کے لئے یہ اچھا قدم ہے وہاں ہم اپنے پروگرام میں تاخیر کے لئے فکرمند بھی ہوئے۔

خیر اب رات بارہ بجے تک کسی نہ کسی طرح وقت تو گزارنا ہی تھا اور یہ امن عامہ کا مسئلہ تھا لہٰذا کسی کے کچھ چاہنے یا نا چاہنے سے کیا ہوسکتا تھا۔ہم نے بازار کی رونقوں سے گزر کر آگے کی طرف چلنا شروع کردیا۔بازار سے خاصا آگے نکل کر ایک جگہ پولیس چیک پوسٹ سے پہلے بہت سی گاڑیاں اور مسافروں کا ایک ہجوم نظر آیا۔ہمارے وہاں تک آتے آتے ہمارا بس ڈرائیور بھی وہیں بس لے آیا۔

یہ جگہ بازار کی نسبت بہت پرسکون تھی۔مکمل تاریکی میں چاروں طرف بلند و بالا پہاڑ ہیولوں کی مانند کھڑے تھے۔دائیں ہاتھ پر کچھ ہی گہرائی میں دریائے سندھ کے پانی کی آواز ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔یہاں موسم خوشگوار تھا اور بازار کی گہما گہمی بھی نہیں تھی۔سڑک کے کنارے تھوڑے تھوڑے وقفے سے پتھروں کی مضبوط حفاظتی رکاوٹیں بنائی گئی تھیں۔ہم آرام سے ان کے اوپر بیٹھ گئے۔

یہ بہت ہی پرسکون لمحات تھے۔دریائے سندھ کے ساتھ، بشام کے پہاڑوں میں شاہراہ قراقرم پر بیٹھنا! وقت تھما تھما محسوس ہوتا تھا اور تیز دوڑتی بھاگتی آلودہ زندگی سے دور پتھروں اور سیمنٹ سے بنی رکاوٹ پر بیٹھنے سے پہلے کسی نے گرد جھاڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

بارہ بجے سے کچھ پہلے سامنے کوہستان کی طرف سے پولیس کی نیلی گھومتی بتیوں والی دو جیپیں آتی نظر آئیں۔ اطمینان سے بیٹھے مسافر اٹھ کھڑے ہوئے۔جیپ کو دیکھتے ہی گاڑیوں کے ڈرائیوروں نے بھی بیک وقت ہارن بجانے شروع کردیئے۔ اس مرتبہ مسافروں نے بھی کسی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے نہایت پھرتی سے اپنی اپنی سیٹیں سنبھال لیں۔

ٹھیک بارہ بجے ایک پولیس جیپ تمام قافلے کے آگے اور ایک سب سے پیچھے کھڑی ہوئیں اور پندرہ بیس گاڑیوں کے اس کارواں نے آہستہ آہستہ سرکنا شروع کردیا۔یہاں سے آگے کا سفر کوہستان میں ہونا تھا۔بس کبھی چڑھائی اور کبھی اترائی پر دائیں بائیں چکر کاٹتی چلی جارہی تھی۔کسی لمبے موڑ پر ایک قطار میں چلتی گاڑیوں کی روشنیاں عجیب منظر پیش کرتی تھیں۔

کوئی ایک بجے کے قریب کوہستان کے اس عظیم پہاڑی علاقے میں ایک عجیب سا نور پھیل گیا۔ غالباً نو تاریخ کا چاند پہاڑوں اور آسمان پر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی شکل میں چھائی بدلیوں کی اوٹ سے نکل کر سارے منظر پر چھا گیا۔ ایک ایسا مسحور کن سماں یقین کیجئے زندگی میں پہلے کبھی کہیں نہیں دیکھا تھا۔

یا سر کانوں میں ایم پی تھری پلیئر کا ایئر فون گھسائے کھڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کونی ماری اور جگہ بدلنے کا اشارہ کیا۔ ایک لمحے کے لئے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے کے بعد پتہ نہیں اسے کیا سمجھ آئی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر شیشہ ہٹا دیا۔ ہوا کے تیز جھونکے میرے منہ پر لگے۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کانوں میں گھسی ٹونٹیاں نکالیں اور اپنی درخواست زبانی طور پر پیش کی۔ بات سمجھ آنے پر اس نے احتجاجی نظروں سے مجھے گھورا لیکن کچھ بولا نہیں اور کھسک کر میری سیٹ پر ہو گیا۔ اب میرے لئے اس حسین سماں سے لطف اندوز ہونے کا پورا موقع تھا۔

آسمان پر سفید اور سرمئی بادل تھے۔ چاند تھوڑے تھوڑے وقفے سے سرمئی بادلوں کے پیچھے چلا جاتا تھا۔ لیکن یہ سرمئی بادل اتنے گہرے نہیں تھے کہ چاند زیادہ دیر تک ان کے پیچھے چھپا رہے۔ بادلوں کے ٹوٹتے جڑتے کنارے چاند کی روشنی سے چمک رہے تھے۔

ہر طرف بلند و بالا پہاڑ اور بہت گہرائی میں وحشی دریائے سندھ انتہائی تیز رفتاری سے رواں تھا۔ چاند جب بادلوں کے پیچھے سے نکلتا تو ایسا لگتا کہ اس کا عکس پانی کی اٹھتی بیٹھتی لہروں کو جیسے چاندی کے سیال میں ڈھال رہا ہو۔ کسی موڑ پر جہاں سے دریا دور تک نظر آتا تھا، چمکتے پانی کی ایک لمبی لکیر دور تک کھنچی نظر آتی تھی۔

ایک دلفریب خوابناک سا منظر جو کسی ماورائی دنیا کا منظر پیش کر رہا تھا۔ جیسے بچپن کی کسی کہانی میں کسی طلسم ہوش ربا کا نقشہ کھینچا گیا ہو۔ کوہ قاف کی جادوئی دنیا میں بھولے بھٹکے مسافروں کو لبھانے کے لئے کسی جادوگر نے ایک مصنوعی منظر تخلیق کیا ہو۔ لیکن یہ کوہستان تھا اور کوہ قاف کے طلسم ہوش ربا سے کہیں زیادہ پرسحر یہ منظر بھی حقیقی تھا۔ قدرت کی یہ انمول کرشمہ سازی ذہن میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی۔

کوئی نصف گھنٹے بعد کوہستان میں داسو کے پل پر دریا بائیں طرف ہو گیا اور کوہستان کی اس چاندنی رات کا سحر بھی اپنا دائمی اثر چھوڑ کر دریا کے ساتھ دوسری سمت میں منتقل ہو گیا۔

کسی نے بتایا تھا کہ کوہستان کی بلندیوں میں ایسے جنگل ہیں جہاں دوپہر کی دھوپ بھی زمین تک نہیں

پہنچتی۔

میدان ایسے ہیں جہاں گھاس اور پھول شادابی کے نئے مفہوم بتاتے ہیں۔

یہاں کی ڈھلوانوں میں بہتے پانیوں کے پاس بیٹھ کر گرمیوں میں بھی سردی محسوس ہوتی ہے۔

اور سر بہادر کی چوٹی کے نیچے نیلگوں تختو سر جھیل میں جب سبزے کا عکس پڑتا ہے تو جنت کی حقیقت نگاہوں کے سامنے پھرتی ہے۔

میں نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی اور سر کھڑکی کے شیشے کے ساتھ ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

شفاف ندیاں، جھرنے، آبشاریں۔۔۔اور ہم پھنس گئے

ابھی سحر ہونے میں کچھ دیر باقی تھی کہ دائیں ہاتھ کے پہاڑوں سے اترتے پرشور اور ٹھنڈی پھوار اڑاتے ایک نالے کے پل سے گزر کر بس رک گئی۔

اس نالے کے ساتھ ساتھ ہوٹلوں اور چائے خانوں کا ایک سلسلہ نظر آرہا تھا۔سڑک کے دونوں طرف رنگین ٹیوب لائیٹیں لگی ہوئی تھیں۔اور ان رنگ برنگی ٹیوب لائیٹوں کی روشنیاں نالے کے جھاگ نما پانی کو اپنے رنگوں میں رنگ رہی تھیں۔

سڑک پر واقع پل کے دونوں طرف کے چائے خانوں نے مسافروں کی تفریح کے لئے لکڑی کے چھجے دریا کے اوپر بنا رکھے تھے جہاں کرسیاں اور چارپائیاں بچھا کر ایک فرحت انگیز سماں پیدا کر دیا گیا تھا۔

یہ کومیلا تھا۔شاہراہ قراقرم پر کوہستان کا ایک معروف ریسٹ پوائنٹ۔

اکثر مسافر بشمول زاہد، عظیم اور یاسر، سرایک طرف ڈھلکائے نیند کے عالم میں تھے۔چند مسافر جاگ رہے تھے جو بس رکنے پر نیچے اترنے لگے۔میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا لیکن نیند سے بیدار کرنا مناسب نا سمجھا اور بس سے باہر آ گیا۔

پتھروں سے ٹکرا کر جھاگ اڑاتا اور دور دور تک اپنی پھوار بکھیرتا یہ نالا کوہستان کے پانچ ہزار میٹر بلند پہاڑوں کی پگھلتی برفوں سے نجانے کن نظاروں اور وادیوں سے ہوتا ہوا کومیلا کے اس مقام پر آ کر دریائے سندھ کے ریتلے پانیوں میں شامل ہو رہا تھا۔

چند چارپائیوں پر ہوٹل کے ملازمین نیند کے وہ مزے لے رہے تھے جو دنیا کے کسی عالیشان اور ائیر کنڈیشنڈ بیڈ روم میں بھی میسر نہیں۔

میرے جیسے چند دیگر مسافروں نے جوں ہی کرسیوں اور چارپائیوں کا رخ کیا، مٹی کے تیل کے چولہے پر چائے بناتے ایک بزرگ نے کوہستانی زبان میں غل مچانا شروع کیا۔اس ڈانٹ ڈپٹ کے نتیجے میں خواب غفلت کا شکار بیرے آنکھیں ملتے، ہڑبڑاتے، چپلیں پہن کر ادھر ادھر ہو لئے۔

مقام شکر ہے کے ان چھجوں کے گرد چوبی حفاظتی باڑ موجود تھی۔ورنہ ایک گہری نیند سے یہ ہنگامی بیداری ان بیروں کے لئے منہ اندھیرے ایک یخ بستہ دریا میں غوطہ خوری کا سبب بھی بن سکتی تھی!

بیشتر پہاڑی نالوں کی طرح یہ نالا بھی بیس پچیس فٹ چوڑا لیکن تیز رفتار تھا۔اس دریا نما نالے کا منظر بھی تقریباً ویسا ہی تھا جیسا ناران میں جھیل سیف الملوک سے آنے والے کنہار یا بحرین سوات والے دلفریب دریا کا ہے۔فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں ہم دریا کے عین اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔

فوراً ہی ایک کپ چائے بغیر پوچھے میرے سامنے رکھ دی گئی۔شاہراہ قراقرم کے کنارے ان ہوٹلوں اور چھپر نما چائے خانوں کے ملازمین مسافروں کی ضروریات سے اچھی طرح واقف ہیں۔انہیں علم ہے کہ رات کے اس آخری پہر طویل سفر کے مسافروں کی چائے سے بہتر خدمت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔چائے ابھی بنائی گئی تھی اس لئے بہت سے چائے خانوں کے برعکس اس کا ذائقہ بھی چائے جیسا ہی تھا!

چائے پیتے پیتے اچانک میری نظر دریا کی دوسری سمت ایک حیرت انگیز کشادہ غار نما کمرے پر پڑی۔

دریا کے دونوں طرف تقریباً ایک ہی جیسے لکڑی کے چھپر نما چائے خانے تھے۔یہ کمرہ سامنے والے چائے خانے کے پہلو میں تقریباً نالے کی سطح پر تھا جس کا کچھ حصہ باہر جلتی ٹیوب لائیٹ کی روشنی میں نظر آتا تھا۔کمرے میں چند چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور نالے کا تھوڑا سا پانی کمرے کے ریتلے فرش پر ایک سمندری لہر کی طرح جاتا اور نکل آتا تھا۔

چائے کے پیسے دے کر میں دوسری طرف ایک چھوٹی سی ڈھلوان اتر کر نالے کے کنارے کنارے اس کمرے میں داخل ہوا اور ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔کمرے کی چھت ایک بہت بڑی چٹان تھی جو باہر سے ایک پہاڑ کی طرح بلند نظر آتی تھی۔تین طرف کی دیواریں بھی چٹانی تھیں اور قدرتی طور پر یہ جگہ ایک کمرے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

فرش گیلی ریت کا تھا جس پر تازہ اور ٹھنڈا پانی مسلسل تازگی اور نمی کا احساس پیدا کر رہا تھا۔ان تمام عناصر کی وجہ سے قدرتی طور پر اس پتھریلی آرامگاہ کی ٹھنڈک ایسی تھی کہ جس کی کوئی مثال نہیں۔مشینوں کی ٹھنڈک کبھی زیادہ کبھی

کم ہوسکتی ہے لیکن یہاں سکون اور خوشگواریت کا ایک ایسا ماحول تھا کہ اگر میں چند لمحے مزید وہاں رہتا تو یقیناً گہری نیند سو جاتا۔ اور اگر سو جاتا تو کسی کو بھی معلوم نا ہوتا کہ بس کا ایک مسافر پتھریلے سرد خانے میں بان کی ایک چارپائی پر محو استراحت ہے۔ میرے ساتھیوں میں سے کسی کی آنکھ کھلنے پر ایک مسافر کی کمی کا انکشاف ہوتا لیکن شائد اس وقت تک بس چلاس پہنچ چکی ہوتی۔

سکون کے چند گہرے سانس لے کر میں باہر آیا اور پتھروں پر چلتا ہوا واپس بس میں سوار ہو گیا۔

سحر کے ملگجے اندھیرے سے صبح کی روشنی پھیلتے پھیلتے ہم چلاس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ کوہستان کا ضلع اپنی حدود سمیٹ رہا تھا اور علاقے کا رنگ سبز سے بھورے میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

ایبٹ آباد سے لے کر کوہستان تک تمام سفر ایک سرسبز پہاڑی علاقے میں ہوتا ہے۔

جگہ جگہ شفاف ندیاں، جھرنوں کو جنم دیتی بلند و بالا آبشاریں اور چشمے ___ چیڑھ اور دیودار کے گھنے جنگلات سے لبریز پہاڑوں پر جمی برفوں سے پگھل پگھل کر بل کھاتے دریائے سندھ میں گر رہے ہیں۔ ان پرفضا اور حسین علاقوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹی بڑی آبادیاں سڑک کے اطراف اور دریا کے پار بلندی تک موجود ہیں۔ یہاں قدرت اپنی تخلیقی وسعت کا ایک فرحت انگیز انداز پیش کرتی ہے۔

چلاس کے قریب پہنچ کر مناظر اپنا رنگ بدلتے ہیں۔

بھورے رنگ کی پتھریلی چٹانیں ___ کم گہرائی اور کہیں تقریباً سڑک کی سطح پر بہتے دریائے سندھ کے کنارے ریت اور دھوپ کی تمازت! ___ قدرت کا کمال یہ کہ آپ بتدریج بلندی پر جا رہے ہیں ___ ہمالیہ اور قراقرم کے پہاڑوں کا آغاز ہونے کو ہے ___ دنیا کی بلند ترین سرتاقامت برف میں ملبوس چوٹیاں کچھ ہی دیر میں ان پتھریلی چٹانوں کی اوٹ سے جھانکنا شروع کریں گی ___ لیکن موسم خشک اور گرم، سبزہ نہایت کم ___

اب ذرا شاہراہ قراقرم سے ہٹ کر آپ کسی بھی کچے پکے راستے پر جیپ کے ذریعے یا پیدل بلند علاقوں کا سفر کریں ___ تو گھنے جنگلات اور شفاف پانیوں سے لبریز کسی جنت میں جا نکلتے ہیں۔

چلاس میں داخل ہوتے ہی ہر طرف لکڑی کے بڑے بڑے شہتیروں کا ڈھیر جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ کوہستان کے بعض علاقوں میں بھی لکڑی کے ڈھیر نظر آئے تھے لیکن چلاس کے قریب ان ڈھیروں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ شہتیر اردگرد کی بلندیوں پر واقع گھنے جنگلوں سے حاصل کردہ ہیں۔ نہایت اعلیٰ معیار کی یہ لکڑی یہاں اس بہتات میں ہے کہ

دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ لکڑی چیرنے اور کاٹنے کی مشینیں بھی قریب ہی لگی ہوئی ہیں جہاں بڑے بڑے تنوں کو کاٹ کر شہتیروں کی شکل میں ڈھالا جاتا ہے۔ یقیناً یہ لکڑی ٹرکوں میں لدوا کر پاکستان کے مختلف شہروں میں تعمیراتی اور آرائشی ضروریات کو پورا کرنے کے بھیجی جاتی ہوگی۔

ناشتے کا پڑاؤ اب چلاس میں ہونا تھا۔

شاہراہ قراقرم پر واقع ایک ہوٹل کے احاطے میں بس رکی اور لوگوں کی عجلت دیکھ کر ہم نے مناسب یہی سمجھا کہ کچھ صبر کر لیا جائے۔

سب مسافروں کے بعد ہم لوگ بس سے اترے اور ہوٹل کے احاطے میں داخل ہوئے جہاں گھاس کے دولانوں کے ایک طرف کھانے کی عمارت قائم تھی۔ تمام لوگ ہوٹل کے ایک خاص حصے کے باہر یوں کھڑے تھے جیسے ریلوے ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے اردگرد بھیڑ ہوتی ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ خاص حصہ کونسا ہوسکتا تھا!

کافی دیر بعد جب ہم چاروں ایک میز پر اکٹھے ہو سکے ہمارے چہرے اور ہاتھ گیلے تھے جب کہ آنکھوں میں رات جاگنے یا نیند پوری نا ہونے کی سرخی تھی۔ بھوک چمک رہی تھی اس لئے سب کو مینو کی فکر ہوئی۔ خالی ٹرے اٹھائے تیزی سے جاتے ایک ویٹر کو آواز دے کر بلایا اور مینو پوچھا۔

معلوم ہوا کہ مسافروں کی سہولت کی خاطر ہوٹل والوں نے مینو کا جھنجھٹ ہی نہیں پالا اور صرف روٹی، ہاف فرائی انڈہ اور چائے پر مشتمل ناشتہ بغیر پوچھے سب بھوکوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔

''یار، ایک آملیٹ لے آنا اور تین ہاف فرائی۔۔'' یاسر کا خیال تھا کہ ہاف فرائی انڈہ ہے تو آملیٹ بنانے میں کیا مسئلہ ہوسکتا ہے۔

''ہاف فرائی انڈہ تیار ہے اور آملیٹ میں دیر لگے گا۔ انتظار کروا بھی چولہا خالی ہو تو بناتا ہے'' ویٹر نے فوراً جواب دیا۔

''چلو، پھر کیا ہوسکتا ہے۔۔ جو ہے لے آؤ'' یاسر کو مایوسی ہوئی۔

''کیا ایک ہی چولہے پر سب کچھ تیار ہو رہا ہے ادھر؟ عجیب بات ہے بھئی!'' عظیم کو حیرت ہوئی۔

ناشتہ آیا تو اس نعمت سے بہرہ مند ہوئے۔ روٹی کھٹی تھی بلکہ بہت کھٹی تھی۔ ایک چولہے پر شائد کافی دیر سے انڈے تلے جا رہے تھے اس لئے اب ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ اچھی خاصی بھوک کے عالم میں بھی ہم چاروں ایک روٹی ہی ختم

نہ کر پائے۔ چلاسی آٹے کو انتہائی خمیر کر کے کھانے کے عادی ہیں اور یہی سب مسافروں کو بھی ملتی ہے۔

یاسر نے تو ایک نوالہ لینے کے بعد صرف چائے پی جبکہ ہم تینوں نے کچھ نہ کچھ زہر مار کر ہی لیا۔ نہایت مہنگے نرخوں پر اتنا کم ناشتہ اس سے پہلے ہم نے کبھی نہیں کیا تھا۔

''یاسر، یار ادھر ادھر کوئی دوکان وغیرہ دیکھو اور کوئی مناسب چیز لے کر کھالو۔'' میں نے یاسر کو مشورہ دیا۔

''بس چائے پی لی ہے۔ کافی ہے اب میرا موڈ نہیں کچھ کھانے کا۔'' یاسر کا موڈ واقعی آف ہو چکا تھا۔

اچانک بس کی مترنم گنگناہٹ نے ماحول کو گھیرے میں لے لیا۔ مسافروں کی بدذوقی دیکھئے کہ بس ڈرائیور کی اعلیٰ فنکارانہ صلاحیتوں کی داد دینے اور مقرر ارشاد کی فرمائش کے بجائے فوراً بس میں سوار ہو گئے۔

بس روانہ ہوئی تو دن مکمل طور پر روشن ہو چکا تھا اور چلاس اپنی روایتی حدت کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

سڑک کے بائیں طرف دریائے سندھ اور دائیں طرف ایک ریتلا میدان تھا۔ میدان میں گہرے بھورے رنگ کی چھوٹی بڑی چٹانیں پڑی تھیں۔ میدان سے آگے خشک پتھریلے پہاڑ تھے۔ دریا کے کنارے دور دور تک سفید ریت پھیلی ہوئی تھی۔ ریت اتنی سفید تھی کہ دھوپ سے اس کی چمک آنکھوں کو چندھیاتی تھی۔ دریا کے پار بھی خشک پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ دکھائی دیتا تھا۔

یہ نہیں کہ چلاس اور ملحقہ علاقہ درختوں سے بالکل خالی ہے۔ غالباً لوگوں نے اپنی کوششوں سے سڑک کے کنارے بعض مقامات پر شجر کاری کی ہے۔ کہیں کہیں قدرتی طور پر بھی درخت موجود ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر یہ ایک بنجر علاقہ ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوہستان سے آگے کا علاقہ مون سون ہواؤں کے خطے سے باہر ہے۔ بارشوں کی کمی بلکہ تقریباً نا ہونے کے باعث یہاں سے آگے کا تمام علاقہ خشک اور بنجر پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ جہاں کہیں بلندیوں کا پانی میسر ہو وہاں البتہ سبزہ نظر آتا ہے۔

البتہ یہاں ایک چیز بہت خاص معلوم ہوئی۔ یہ خاص چیز ایک خاص گھاس نما بوٹی ہے جو یہاں بہتات میں پائی جاتی ہے۔ اس پر چھوٹے چھوٹے دانے کثرت سے ہوتے ہیں۔ چند برس قبل اسی علاقے سے گزرتے ہوئے ہماری گاڑی کہیں رکی۔ پہاڑ سے پہلے سڑک کے ساتھ کچھ دور تک یہی بوٹی کثرت سے اگی ہوئی تھی۔ چلاس کے ایک مقامی باشندے نے کہا کہ آپ اس بوٹی کو اپنی انگلیوں سے مسل کر سونگھیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا اور جب اسے سونگھا تو تروتازگی کی ایک خوشگوار مہک سانسوں میں اتری۔ اس علاقے بلکہ شمالی علاقہ جات بھر میں یہ بوٹی نہایت

کثرت سے پائی جاتی ہے اور شاید اسی وجہ سے یہاں کی فضا میں ہر وقت تروتازگی کی لہریں جاری رہتی ہیں۔

چلاس کی خشکی اور گرمی تو مشہور ہے ہی لیکن اس کی تاریخی اور سیاحتی اہمیت کسی اور وجہ سے ہے۔

چلاس میں وہ شہرہ آفاق نادر چٹانیں ہیں جن پر قدیم نقش ونگار کندہ ہیں۔ ایک ہزار سے پانچ ہزار سال قبل مسیح کی یہ چٹانیں قدیم ترین تاریخ کے اوراق ہیں۔ زمانوں کی شکست وریخت سے بے نیاز ان چٹانوں پر کندہ یہ نشانات حملہ آوروں، تاجروں اور مبلغین کے بنائے ہوئے ہیں۔ یوں تو شاہراہ قراقرم کے اردگرد بیس ہزار سے زائد ایسے مقامات ہیں جہاں یہ نقش ونگار آمیز چٹانیں اور پتھر موجود ہیں۔ لیکن کوہستان میں شتیال اور ہنزہ کا درمیانی علاقہ ان سے بھرا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مختلف اشکال مثلاً جانوروں، انسانوں اور شکار وغیرہ کے مناظر پر مبنی یہ نشان عہد قدیم کے لوگوں کے لئے تحریر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان تحریروں کے ذریعے عہد قدیم کے حالات کا علم دنیا بھر سے تاریخ اور آثار قدیمہ کے ماہرین اور طلبہ کو چلاس اور اس سے ملحقہ علاقوں میں کھینچ لاتا ہے۔

سڑک کے دائیں طرف ایسی ہی بعض چٹانیں نظر آئیں اور تیزی سے پیچھے رہ گئیں۔

زاہد، یاسر اور عظیم خاصی دیر سے مشکوک حرکتیں کر رہے تھے۔ وہ کبھی سر جوڑ کر ایک دوسرے کو کچھ کہتے اور پھر کھڑکی یا سامنے شیشے سے آسمان کی سمت کسی خشک پہاڑ کے پیچھے اشارہ کرتے۔ میں سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔۔۔

نانگا پربت!

چلاس کی شہرت کی اہم ترین وجہ۔۔۔ ہمالیہ کے سلسلے میں واقع یہ پہاڑ چلاس شروع ہونے سے پہلے ہی کہیں کہیں خشک پہاڑوں کی اوٹ سے دکھائی دینے لگتا ہے۔ لیکن اکثر اوقات بادلوں میں چھپا رہنے کی وجہ سے اندازہ نہیں ہوتا کہ آپ بادلوں کو دیکھ رہے ہیں یا یہ کسی برف پوش پہاڑ کا نظارہ ہے۔

آٹھ ہزار ایک سو چھبیس میٹر بلند یہ پہاڑ ان گنت کہانیوں کو جنم دے چکا ہے۔ دنیا کی چودہ آٹھ ہزار میٹر کی چوٹیوں میں سے ایک لیکن مشکل ترین چوٹی۔ کوہ پیماؤں کے لئے اس سے بڑا چیلنج اور کوئی نہیں۔ عمودی اور برف سے خالی دیواریں اور خوفناک ترین طوفان کئی کوہ پیماؤں کی جان لے چکے ہیں۔ 1953 میں پہلی دفعہ سر ہونے تک یہ پہاڑ اکتیس نامور کوہ پیماؤں کو ہلاک کر چکا تھا۔ خونی پہاڑ اور قاتل پہاڑ!

سڑک کے ذریعے سفر کرنے کا سب سے بڑا فائدہ ہماری نظر میں یہ ہے کہ نانگا پربت کا شاندار نظارہ میسر آتا ہے۔ ایک شاندار پہاڑ کا بھرپور نظارہ!

یوں تو بے شمار مقامات سے اور دور دور سے یہ عظیم الشان پہاڑ دکھائی دیتا ہے۔لیکن تین اطراف سے اس کا منظر مکمل اور انتہائی متاثر کن ہے۔ان اطراف میں روپل، دیامر اور رائی کوٹ شامل ہیں۔شاہراہ قراقرم سے دیامر اور رائی کوٹ سمت کا نظارہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔روپل کے لئے براستہ استور، تراشنگ سے پیدل سفر کرنا پڑتا ہے۔لیکن کہا جاتا ہے کہ روپل سے دیکھیں تو نانگا پربت دنیا کا بلند ترین پہاڑ ہے جو بیس کیمپ سے چار ہزار چھ سو میٹر بلند ہے۔یعنی ساڑھے چار کلومیٹر سے زیادہ لمبائی آپ کے سامنے ہے لیکن رخ آسمان کی طرف ہے!

اس خونی پہاڑ کا ایک اور مقامی نام دیامر ہے۔اور اس کی وجہ سے ہی اس کے اردگرد کے بہت بڑے علاقے کو دیامر کے نام سے جانا جاتا ہے۔رائی کوٹ، چونگڑہ اور جلی پور اس کے اردگرد واقع چند دیگر برف پوش چوٹیاں ہیں۔ یہ چوٹیاں بھی نانگا پربت کے سلسلے میں ہی گنی جاتی ہیں۔

چلاس سے لگ بھگ ایک گھنٹے کے فاصلے پر واقع رائی کوٹ کا پل نانگا پربت کی طرف جانے والے جیپ ٹریک کا نقطہ آغاز ہے۔ فیری میڈوز جو پاکستان کا حسین ترین علاقہ کہلاتا ہے نانگا پربت کو جانے والے اسی راستہ پر واقع ہے۔جیپیں یہاں سے تو تک جاتی ہیں جہاں سے آگے ایک سیدھی لمبی چڑھائی چڑھنا بھی انوکھا تجربہ ہے۔لیکن فیری میڈوز پہنچ کر انسان کو راستے کی کوئی بھی تکلیف اس دیومالائی حسن کے سامنے ہیچ نظر آتی ہے جو اس کے ہر طرف پھیلا ہوتا ہے۔

رائی کوٹ سے گزرتے ہوئے فیری میڈوز اور نانگا پربت بیس کیمپ کی یادیں ایک دفعہ پھر ایسے ہی تازہ ہوگئیں جیسے کل کی بات ہو۔

عظیم پہاڑوں کا سنگم

رائی کوٹ کا پل دریائے سندھ پر واقع شاہراہ قراقرم کا تیسرا پل تھا جہاں دریا نے ایک مرتبہ پھر سمت بدل لی اور ہماری دائیں جانب آ گیا۔

یہاں گلگت کی حدود شروع ہوگئی۔

دائیں جانب اوپر نانگا پربت اور رائی کوٹ پہاڑ اور نیچے دریائے سندھ!

سفر اپنے جوبن پر تھا اور ہمارا رخ اب جگلوٹ کی طرف تھا۔جگلوٹ جو یہاں سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر ہے ایک اہم مقام ہے۔استور، دیوسائی، نانگا پربت اور راما کے لئے جگلوٹ سے ہی گاڑیاں ملتی ہیں۔اس کے علاوہ جگلوٹ نامی اس علاقے کو قدرت نے ایک ایسی انفرادیت سے نوازا ہے جو دنیا کے کسی اور مقام کو حاصل نہیں۔اس مقام پر دنیا کے تین عظیم ترین سلسلہ ہائے کوہ ایک جگہ پر ملتے ہیں۔ ہندوکش، ہمالیہ اور قراقرم! نا دنیا میں ان سے بلند کوئی پہاڑ اور نا جگلوٹ جیسی کوئی جگہ۔

عظیم پہاڑوں کا سنگم۔۔سفید رنگ کی گئی چار دیواری کے اندر ایک یادگار بنائی گئی ہے جہاں یہ الفاظ اس مقام کی اہمیت کا اعلان کر رہے ہیں۔ یہاں سے دریائے سندھ تقریباً "یو" ٹرن لیتا سکردو کی سمت سے آتا ہے۔اس مقام سے دیکھیں تو دریائے سندھ کے 'یو' کے اندر نانگا پربت اور ملحقہ چوٹیاں بالکل واضح نظر آتی ہیں، یہ سلسلہ ہمالیہ ہے جو یہاں آ کر ختم ہو رہا ہے۔دریائے سندھ کے پار خشک اور بھورے پتھریلے پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے جو قراقرم ہے اور تبت سے لے کر چین تک پھیلا ہوا ہے۔بائیں جانب وہ ہندوکش کا سلسلہ گلگت کی طرف سے اس مقام تک آتا ہے۔

سامنے سے دریائے گلگت کا سبزی مائل پانی انڈس کے ریتلے پانی میں مل کر ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے۔دریائے

گلگت کے عین اوپر کچھ فاصلے پر لوہے کے رسوں سے تانا گیا ایک پل اور پل کے عین اوپر پہاڑوں کے پیچھے ایک سر بفلک برف پوش چوٹی نظر آتی ہے۔اس چوٹی کا نام ہراموش ہے۔ ہراموش کے بائیں طرف کچھ ہی فاصلے پر راکاپوشی موسم صاف ہونے کی صورت میں نظر آتی ہے۔ یہ مقام حقیقتاً ایک منفرد اور قابل دید جگہ ہے۔

جگلوٹ میں بس پھر رکی۔

گلگت جانے والے بعض مسافر جو ہماری بس میں موجود تھے یہاں اپنا سامان اتروانے لگے۔بس کی چھت پر ممکنہ بارش اور گرد وغیرہ سے سامان کو محفوظ رکھنے کے لئے ترپال باندھا گیا تھا۔اب سامان نکالنے کے لئے یقیناً کچھ دیر متوقع تھی اس لئے نانگا پربت کے نظارے کے لئے ہم پھر بس سے اتر گئے۔

یاسر نے چلاس میں کچھ نہیں کھایا تھا ہم نے اسے کچھ کھانے کا مشورہ دیا جو اس نے قبول نہ کیا۔وہ شاید صبح کے مینو سے کچھ زیادہ ہی ڈر گیا تھا۔بہر حال بہت کوشش کر کے کچھ بسکٹ اور ایک عدد سیون اپ کی بوتل اس کے معدے میں اتروا ہی دی گئی۔

ہم ایک اوپن ائیر ہوٹل کے صحن میں بچھی چارپائیوں پر ٹکٹکی باندھے نانگا پربت کی طرف دیکھتے رہے۔کئی دفعہ اس قاتل پہاڑ نے بادلوں میں منہ چھپایا اور نکالا۔

''اطہر صاحب،ادھر چوٹی کی طرف دیکھیں۔وہاں سے لے کر یہ نیچے دریا تک سطح کا کتنا فرق ہے۔نظروں کو اوپر سے نیچے دریا تک لاتے لاتے بھی اچھا خاصا وقت لگ جاتا ہے۔''عظیم نے اچانک میری طرف دیکھتے ہو کہا۔

''آپ کی بات سو فیصد صحیح ہے۔میں نے کہیں پڑھا ہے کہ یہ بھی ایک ریکارڈ ہے۔میری معلومات کے مطابق دریائے سندھ سے نانگا پربت کی چوٹی تک سات ہزار میٹر کا فرق ہے۔اور اگر دریا کے کنارے سے لیکر چوٹی تک کے علاقے کا فاصلہ ناپیں تو یہ چھبیس ستائیس کلومیٹر سے زیادہ نہیں۔''عظیم کی بات سے مجھے یاد آیا۔

''یعنی دریا کی بلندی یہاں سطح سمندر کے لحاظ سے گیارہ سو میٹر کے لگ بھگ ہے؟ اور چوٹی آٹھ ہزار میٹر سے زیادہ بلند ہے۔''یاسر نے سوال کیا۔

''ہاں،یہ واقعی زمین اور آسمان کے قلابے ملانے والی بات ہے۔لیکن حقیقت یہی ہے کہ سطح کا اتنا زیادہ فرق اتنے کم فاصلے پر اور کہیں بھی نہیں ہے۔''میں نے کہا۔

''پتہ نہیں اور بھی کیسی کیسی انوکھی باتیں ہوں گی اپنے نانگا پربت کی!''یاسر کی نظریں پھر سے نانگا پربت کا احاطہ

کرنے لگیں۔

ہم نے نانگا پربت کی کئی تصویریں بنائیں طرح طرح کے تبصرے اور معلومات کا تبادلہ ہوا۔لیکن جب کافی دیر ہو گئی اور کسی طرح بھی کوچ کا نقارہ نہ بجا تو ہمیں تشویش ہوئی۔

''بڑی دیر ہوگئی بھئی۔ہارن نہیں بجا بس کا؟''زاہد کو خیال آیا۔

ہمیں کچھ خبر نہ تھی کہ یہاں سے آگے ہماری شامت اعمال کیا گل کھلانے والی ہے۔

ہوٹل سے اٹھ کر باہر آئے اور دیکھا کہ تین چار بسیں اور اتنی ہی ویگنیں بھی ہماری بس کے ساتھ کھڑی ہو چکی ہیں۔ بہت سے لوگ اپنی مقامی زبانوں میں ہاتھ ہلا ہلا کہ کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔معلوم ہوتا تھا کوئی اہم بات ہے۔

ہم قریب ہوئے اور ایک بلتی بھائی سے ماجرا دریافت کیا۔

"لینڈ سلائیڈنگ ہوا ہے"جواب ملا۔

''کہاں؟''زاہد نے ہر طرف گھوم کر دیکھا۔

''ادھر نہیں ادھر آگے ہوا ہے۔سکردو روڈ پر۔''بلتی بھائی زاہد کی سادگی پر مسکرایا۔

کوہستان، چلاس کے کچھ حصے اور گلگت سکردو روڈ پر کسی بھی وقت کسی بھی وجہ سے لینڈ سلائیڈنگ روز کا معمول ہے۔ بارش ہو تب، بارش نا ہو اور گرمی زیادہ ہو تب، کوئی زلزلہ ہو تو بھی اور کہیں برف پگھلنا شروع ہو تو بھی۔

ایسے معاملات سے نمٹنے کے لئے ایف ڈبلیو او کے دفاتر تقریباً ہر علاقے میں قائم ہیں جہاں ضروری مشینیں وغیرہ موجود رہتی ہیں۔ایف ڈبلیو او کے ماہرین لینڈ سلائیڈنگ سے تباہ شدہ سڑک کو کم سے کم وقت میں قابل سفر بنا دیا کرتے ہیں۔ابھی تک ہمیں لینڈ سلائیڈنگ کا سامنا نہیں ہوا تھا اور اس وجہ سے مطمئن بھی تھے۔اب اس کا سامنا ہونے کا اندیشہ لاحق ہوا تو خیال کیا کہ ایف ڈبلیو او ہے نا صحیح کر لے گا سڑک اتنا کیا پریشان ہونا ایک آدھ گھنٹے کی مزید دیر ہی صحیح۔

بلتی بھائی ہماری باتوں کو سن رہے تھے۔ذرا مسکرائے اور بولے۔"سر، دو تین کلومیٹر سڑک دریا میں گرا ہے۔تین دن بھی روڈ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔آپ واپس جاؤ تو اچھا ہے"

ہمارے دماغ بھک سے اڑ گئے۔واپس جاؤ!!اتنی آسانی سے اتنی بڑی بات!

ہم ابھی تک اسی خیال میں تھے کہ یہ بھائی صاحب ہمیں دھمکانے اور نیا سمجھ کر کچھ مذاق کے موڈ میں ہیں۔ایک دو

حضرات سے اور بات کرنے کے بعد بھی یہی اطلاعات ملیں تو سخت پریشانی ہوئی۔

اتنے میں بس کا کنڈیکٹر بھی آ گیا۔بس کے مسافر بھی جمع ہو چکے تھے اور کنڈیکٹر سے مصدقہ معلومات کی توقع رکھتے تھے۔

''بھائی آگے سڑک ٹوٹ گیا ہے اور بس ادھر سے نہیں جا سکتی۔اب دو باتیں ہو سکتا ہے۔لینڈ سلائیڈنگ تک ہم بس لے جائیں گے، جو آگے جائے گا ہم وہاں تک کا کرایہ لے کر باقی پیسے واپس دے گا۔جس نے ادھر اترنا ہے وہ ہم سے بقایا لے لے۔آگے آپ مرضی سے جاؤ!۔''

ایسے موقعوں پر ہوتا یہ ہے کہ لینڈ سلائیڈنگ کی دوسری طرف وہاں سے آنے والی گاڑیاں آ کر رک جاتی ہیں اور اس طرف یہاں کی گاڑیاں۔لینڈ سلائیڈنگ والی جگہ سے مسافر پیدل دوسری طرف جاتے ہیں اور ادھر والے ادھر کی گاڑیوں میں اور ادھر والے ادھر کی گاڑیوں میں بیٹھ کر اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔

لیکن ہمارا معاملہ ذرا مختلف تھا۔دو کلومیٹر کا فاصلہ گلگت سکردو روڈ پر اس گرمی میں اور دس وزنی بیگوں کے ساتھ پیدل سفر بے حد مشکل کام ثابت ہو سکتا تھا!

پہلے بشام میں کئی گھنٹے کا انتظار اور اب لینڈ سلائیڈنگ، وہ بھی ایسی کہ جس نے ایک طویل پختہ سڑک کو دریا برد کر دیا تھا۔ہم اپنے پروگرام کے مطابق پہلے ہی بہت لیٹ ہو چکے تھے۔

''یار، ادھر سے کوئی اور راستہ نہیں ہے سکردو کا؟''عظیم نے پوچھا۔

''ایک آپشن ہے۔یہاں سے دوسری گاڑی لیں اور تین چار گھنٹے میں استور پہنچیں۔وہاں سے جیپ لے کر چلم چونگی تک ایک لمبا سفر کریں اور چلم سے اسپیشل جیپ کر کے دیوسائی کے راستے ست پارہ جھیل اور سکردو! یہ کوئی دو دن اور کئی ہزار روپے کا پتھریلا سفر ہوگا۔کیا خیال ہے۔۔چلیں؟''یاسر کا ابھی ناشتے والا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔اب لینڈ سلائیڈنگ کا سامنا ہوتا دیکھ کر اس کا مزاج مزید بگڑ گیا تھا۔

''اس طرح تو ہم یہاں سے نگر بھی جا سکتے ہیں۔وہاں سے ہسپر گلیشیئر سے ہوتے ہوئے بیافو گلیشیئر پر۔۔اور پھر بالتورو گلیشیئر سے کنکورڈیا پہنچ جائیں گے۔اسی بہانے راستے میں سنولیک بھی دیکھ لیں گے۔۔''میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا! واہ بھئی۔۔بڑے راستے معلوم ہیں تم سب کو۔۔بس پھر دیکھ لو نا کوئی آسان طریقہ۔۔''زاہد کو تسلی ہوئی کہ

مزید راستے بھی ہیں۔

لیکن میرا بتایا ہوا راستہ یاسر کے تجویز کردہ سفر سے کہیں زیادہ مہنگا، مشکل اور طویل تھا۔میں نے یہ بات زاہد کو بتائی تو اس کا منہ لٹک گیا۔

''زاہد تمہیں یاد ہے؟ فیری میڈوز سے واپسی پر شتیال کا پل ٹوٹا ہوا تھا۔اس وقت بھی ہم نے تھوڑا سا پیدل سفر کیا تھا سامان کے ساتھ۔اب اس سڑک پر یہ مسئلے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔اب بھی اللہ خیر کرے گا تھوڑی سی مشکل ہی سہی!'' میں نے ان تینوں کی پریشانی دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہمیں لینڈ سلائیڈنگ تک جانا چاہئے۔دیر تو ہوگی، پر اب سکردو تو پہنچنا ہے۔ایک اور ایڈونچر!''عظیم نے بھی صورتحال کو بھانپتے ہوئے کہا۔

کوئی اور چارہ کار نہ دیکھ کر لینڈ سلائیڈنگ تک جانے کا ہی فیصلہ کرنا پڑا۔۔ڈھیلے ڈھیلے انداز میں چلے اور بس میں اپنی سیٹوں پر جا کر بیٹھ گئے۔اکثر مسافروں نے بھی یہی مناسب سمجھا تھا۔

اب جو بھی ہو اد یکھا جائے گا۔۔

مشکلیں اتنی پڑیں ہم پہ۔۔۔

جگلوٹ سے چند کلومیٹر بعد شاہراہ قراقرم سے الگ ہوکر ہم دریائے گلگت کے پل کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اس مقام پر سکردو، گلگت، ہنزہ اور نگر کے لئے سڑکیں علیحدہ ہوجاتی ہیں۔ پہلے ایک سڑک دریائے گلگت کے عالیشان پل کو پار کر کے سکردو کی سمت جاتی ہے۔ اس سے کچھ آگے عظیم شاہراہ قراقرم ہنزہ، نگر اور خنجراب سے ہوتی ہوئی چین کے اندر تک چلتی رہتی ہے۔ اور سیدھی سڑک گلگت کے بس اڈے، شہر اور مختلف وادیوں تک رہنمائی کرتی ہے۔

اب تک ہم نے شاہراہ قراقرم پر سفر کیا تھا۔ لیکن اب چند ہی منٹوں میں ہمارا راستہ اس شاہراہ سے الگ ہو رہا تھا۔ شاہراہ قراقرم پاکستان اور چین کے انجنیئروں اور محنت کشوں کی شبانہ روز محنت و جرات کا وہ انمول نمونہ ہے جسے دیکھ کر دنیا کا کوئی بھی شخص حیرت کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ گنا جاتا ہے۔ عظیم اور دشوار ترین پہاڑوں کے درمیان اس عجوبے کی تعمیر کے دوران چار سو سے زائد مزدوروں و انجنیئروں کی جان ایک عظیم مقصد کی نذر ہوئی۔ موسموں کے اتار چڑھاؤ، شدید ترین برف باری اور لینڈ سلائیڈنگ کے ہمہ وقت خطرے کے باوجود اس سڑک کا بنایا جانا اور برقرار رکھنا حقیقتاً ایک معجزہ ہی ہے۔ اور اس معجزے کو ممکن بنانے میں ایف ڈبلیو او کے ماہرین اور کارکنوں کا کردار قابل تحسین ہے۔ خنجراب کے مقام پر شاہراہ قراقرم کی بلندی 4800 میٹر تک پہنچ جاتی ہے جہاں اسے دنیا کی بلند ترین عوامی شاہراہ ہونے کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔

سکردو کی طرف مڑ کر پل کے نیچے سے گزرتے دریائے گلگت کا منظر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ خنجراب سے لے کر گلگت کی حسین وادیوں، لاتعداد برفوں اور چشموں کا پانی لئے ایک بہت بڑا دریا۔ بس کے شیشوں سے نیچے دیکھتے ہوئے محسوس ہوا کہ یہ پانی کہیں اپنے اندر ہی نہ کھینچ لے۔

کافی دیر تک بس تیز رفتاری سے چلتی رہی۔ بار بار دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ کاش ساری اطلاعات غلط ہوں اور سڑک ٹھیک ہو یا ٹھیک کر دی گئی ہو۔ لیکن دوسری طرف سے کسی گاڑی کو نہ آتا دیکھ کر تشویش میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ تقریباً سب لوگ خاموش تھے اور آنے والی مشکل کے بارے میں ہی سوچ رہے تھے۔

چالیس پینتالیس منٹ بعد ہجوم کی صورت میں بسیں اور ویگنیں کھڑی نظر آنے لگیں۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے لینڈ سلائیڈنگ کا آغاز ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ قریب ہوتے ہوتے ہماری بس اس مقام پر جا رکی۔ مسافروں نے اتر کا حالات کا جائزہ لیا بلتی زبان میں بہت سے مکالمے ہوئے اور یاسر، عظیم اور زاہد بس کی چھت سے سامان اترنے کا انتظار کرنے لگے۔

میں نے آگے جا کر لینڈ سلائیڈنگ کے حالات جاننے کی کوشش کی۔

چند میٹر کے فاصلے پر ایف ڈبلیو او کی ایک کرین پہاڑ سے پتھر لے کر ایک بہت گہرے گڑھے میں ڈال رہی تھی۔ نزدیک گیا، ایک پختہ سڑک پر اتنا گہرا گڑھا پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ گڑھا کیا تھا ایک کنواں تھا۔ اور نظر آ رہا تھا کہ آگے بھی ایسے ہی کئی گڑھے موجود ہیں۔

لینڈ سلائیڈنگ کا سبب سمجھ نہیں آیا۔ موسم بھی صاف تھا کہیں بارش کا گمان نہیں ہو رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ کوئی زلزلہ آیا تھا جس کی وجہ سے بلندی پر پڑی بہت سے بھاری چٹانیں سڑک پر لڑھک آئیں اور کہیں گہرے گڑھے ڈال کر اور کہیں پوری سڑک کو لیتی ہوئی دریا میں جا گریں۔

دوسری طرف سے کچھ لوگ ایک ایک دو دو کی تعداد میں سامان اٹھائے تھکے ماندے چلے آ رہے تھے۔ ان سے معلوم کیا کہ آگے کیا حالات ہیں۔ پتا چلا کہ بہت دور تک ایسا بلکہ اس سے بھی زیادہ برا حال ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ راستے میں سایہ بھی بہت کم ہے اور پانی بھی نہیں ہے!

واپس آ کر باقی ٹیم کو یہ حالات بتائے۔ کنڈیکٹر نے حسب وعدہ باقی کا کرایہ واپس کیا اور ہم دس عدد بھاری بھرکم بیگوں کے ساتھ، ساری رات کے جاگے اور تقریباً بغیر ناشتہ کیے اپنی ہمتوں کو مجتمع کرنے لگے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ چار لوگ دس وزنی بیگوں کو بیک وقت کئی کلومیٹر دور کیسے لے کر جائیں؟ ایک تجویز یہ تھی کہ متعدد چکروں میں یہ کام کیا جائے۔ یعنی تین ممبران ایک ایک بیگ لے کر جائیں اور ایک یہاں باقی سامان کے پاس بیٹھے۔ وہاں جا کر ایک ممبر وہاں کے سامان کی نگرانی کرے اور دو واپس آ کر مزید دو بیگ وہاں پہنچائیں۔ لیکن

اس صورت میں ہم انہیں چکروں میں پڑے رہتے اور رات ہو جاتی۔ رات کو اس کٹی پھٹی سنسان و ویران سڑک پر کیمپ لگا کر رہتے۔ مزید یہ کہ اپنے پروگرام سے کم از کم دو دن لیٹ ہو جاتے۔ کیونکہ ابھی آگے کم از کم چھ سات گھنٹے کا سفر باقی تھا اور لینڈ سلائیڈنگ سے دوسری طرف کی صورت حال کا کچھ اندازہ نہ تھا۔

بالآخر فیصلہ یہ کیا گیا کہ سامان کو برابر تقسیم کر کے آٹھ بیگ تیار کریں اور دو بیگ بیک وقت اٹھا کر لے جائے جائیں تا کہ جلد از جلد تمام ساتھی سامان سمیت دوسری طرف منتقل ہو سکیں۔

اندازے کے مطابق سامان کو برابر کیا گیا۔ سب نے دو دو بیگ لٹکائے اور آہستہ آہستہ چل پڑے۔ لینڈ سلائیڈنگ کی حشر خیزیاں دیکھتے، دوسری طرف کے مسافروں کی پسینے سے شرابور حالت کو ملاحظہ کرتے اور اپنے آپ کو کوستے لڑکھڑاتے چلتے رہے۔

ہمارے بائیں طرف چالیس پچاس فٹ چوڑی اس سڑک سے قراقرم کے پتھریلے پہاڑ بلند ہو رہے تھے۔ دائیں جانب نیچے سو ڈیڑھ سو میٹر کی گہرائی میں دریائے سندھ انتہائی تیز رفتاری اور شور کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ سڑک کے کنارے سے دریائے سندھ تک چھوٹے بڑے گول پتھروں پر مشتمل نہایت تند ڈھلوان تھی جہاں سے دریا کے کنارے پہنچنا ناممکن تھا۔

دو بیگ اٹھا کر چلنا آسان نا تھا۔ تپتی دھوپ اور تیز ہوا ماحول کی خشکی میں اضافہ کر رہی تھی اور پسینہ جسم کے مساموں سے پھوٹ رہا تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد سانس پھولنے پر ہم کسی پتھر پر بیٹھ کر کچھ آرام کرتے۔ ذرا سانس بحال ہوتی تو پھر سے اس بن بلائی مصیبت کا سامنا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے۔

سکردو کی طرف سے آنے والے بھی ہماری طرح مشکل میں تھے۔ بلتی، فوجی اور چند غیر ملکی آتے اور سلام دعا، ہیلو ہائی کرتے گزر جاتے۔

ان لوگوں میں سے بلتی حضرات کی ہمت اور جفاکشی قابل دید تھی۔ ٹین کے بڑے بڑے ٹرنک نما صندوق اٹھائے، کوئی لکڑی کے بکسوں میں نجانے کیا کچھ بھرے، کہیں رسیوں سے اپنے جسم کے ساتھ باندھے کہیں ہاتھوں سے قابو کئے چلتے آ رہے تھے۔ پسینے سے ان کے کپڑے مکمل گیلے ہو چکے تھے لیکن پھر بھی ایک مسکراہٹ کے ساتھ "اسلام علیکم" کہتے گزرتے تھے۔

آہستہ آہستہ ہم چاروں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ جو جہاں تھکا وہیں آرام کے لئے بیٹھ گیا جس میں کچھ دم تھا

وہ چلتا رہا۔ فاصلہ تھا کہ ختم ہونے پر نہیں آ رہا تھا۔

''اسلام علیکم بھائی صاحب، آگے کتنا راستہ رہ گیا ہے؟''

سامنے سے آتے ایک بلتی کو دیکھ کر میں رکا اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ پوچھا۔

''ابھی تھوڑا ہے۔ آدھا گھنٹہ چلے گا تو ادھر اوپر پتھروں سے دوسری طرف پہنچے گا'' اس نے موڑ مڑتی اور چڑھائی چڑھتی تباہ حال سڑک پر ہاتھ کے اشارے سے دو تین موڑ بتائے۔

''ادھر کوئی بس وغیرہ ہے سکردو جانے کے لئے؟''

''کوئی کوئی آتا ہے سواری اتار کر واپس جاتا ہے۔ جلد جاؤ تو کوئی ویگن ملے گا'' بلتی بھائی نے بتایا۔

چلتے چلتے قریباً پون گھنٹہ تو ہو ہی چکا تھا آدھے گھنٹے کا سن کر ایک لمحے کے لئے تو سکتا طاری ہو گیا لیکن پھر سر جھکا کر چلنے کی مجبوری کا احساس غالب آ گیا۔

جوں جوں آگے بڑھتے، تھکاوٹ کی وجہ سے آرام کے وقفے بھی بڑھتے جاتے تھے۔ بہت دیر بعد ایک توڑ ڈالنے والی چڑھائی اور پے در پے موڑ مڑ کے کچھ ٹرکوں کے آثار دکھائی دیئے تو کچھ امید بندھی۔

نہایت زور لگا کر آخر کار یہ فاصلہ بھی طے کیا، سڑک کے کنارے بیگ پھینکے اور خود بھی گر پڑا۔

پورے راستے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں مل سکا تھا اور حلق میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ایک صاحب کے ہاتھ میں پانی کی بوتل دیکھ کر پانی کی درخواست کی جو انہوں نے خوشدلی سے قبول کی۔ چند گھونٹ لینے کے بعد کچھ جان میں جان آئی لیکن جسم کا کوئی حصہ دماغ کے فیصلوں کا ساتھ دینے پر تیار نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ آگے جا کر کسی ویگن یا بس میں چار لوگوں کی جگہ کا بندوبست کر سکوں۔ لیکن تھکاوٹ بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ ابھی وہ تینوں بھی کہیں راستے میں تھے اور پتہ نہیں کب تک پہنچتے۔

ابھی میں حواس بحال کر ہی رہا تھا کہ ایک خوش شکل اور خوش مزاج بلتی نوجوان میرے پاس آ گیا۔

"بھائی، آپ نیچے سے آیا ہے؟"

بلندیوں کے رہنے والوں کو ہم میدانی علاقے کے لوگ نیچے سے آنے والے ہی لگتے ہوں گے۔

میرے اثبات میں جواب دینے پر اس نے کہا، "آپ بہت تھک گیا ہے، پانی کی بوتل ہے تو دو میں ادھر سے ٹھنڈا پانی لا کر دیتا ہے"۔

خوشی اور شکر گزاری کے ساتھ میں نے ایک بیگ سے بوتل اسے نکال کر دی، ''کیا ادھر قریب پانی ہے؟''

"ادھر بہت اچھا آبشار ہے، ٹھنڈا پانی۔ سڑک کے اوپر ہے دس منٹ آگے جاؤ"۔

وہ تو بوتل لے کر چلا گیا لیکن میں باقی سامان اور ٹیم ممبرز کی غیر موجودگی میں یہاں سے ہل بھی نہ سکتا تھا۔ چاروں طرف کسی درخت کیا گھاس کی پتی کا بھی وجود نہ تھا۔ نیچے دریائے سندھ تھا جس میں چھلانگ لگا کر خودکشی کی خواہش تو بآسانی پوری کی جاسکتی تھی لیکن کوئی اور خواہش کسی صورت قابل عمل نہ تھی۔

مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ چند اور لوگ بھی یہاں تک پہنچے تھے۔ مجھ سے پہلے بھی یہاں لوگ تھے لیکن اب وہ نظر نہیں آرہے۔ چاروں طرف دیکھا لیکن ایک دو حضرات کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔ یہ لوگ کہاں چلے گئے؟

ایک ٹرک کے نیچے چند چپلیں اور پھر ٹانگیں نظر آئیں۔ جھک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ٹرکوں کی اس قطار کے نیچے تو ایک جہاں آباد ہے۔ گرمی کے ستائے تھکے ماندے مسافر سائے کی تلاش میں بالآخر ٹرکوں کے نیچے جا لیٹے تھے۔

چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے بھی قریب ترین ٹرک کا انتخاب کیا اور گرم سڑک پر نہایت بے تکلفی سے لیٹ گیا۔

پہلی مرتبہ کسی ٹرک کو نیچے سے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہاں سے لیٹے لیٹے دور تک راستہ نظر آرہا تھا جہاں بہت دیر گزرنے کے باوجود زاہد، یاسر اور عظیم کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

مجھے فکر ہونے لگی۔ راستہ خطرناک تھا اور پیاس کی شدت کسی بھی حادثے کا باعث بن سکتی تھی۔

کچھ دیر کے بعد میں ٹرک کے نیچے سے بمشکل باہر آیا اور ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ یہاں بلندی تھی اور نیچے کچھ فاصلے پر ایک موڑ تک آنے والے لوگوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ کئی لوگوں سے اپنے ساتھیوں کا حلیہ بتا کر ان کے بارے میں پوچھا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ ایک جگہ بیٹھے ہوئے ہیں آتے ہی ہونگے۔ یہ سن کر اطمینان ہوا اور اس کے کچھ دیر بعد بری طرح نڈھال یاسر موڑ مڑتا نظر بھی آ گیا۔

آہستہ آہستہ ہانپتا کانپتا یاسر میرے پاس آ پہنچا۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ ساری رات کی بے خوابی اور بھوک و پیاس نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ اتنے میں وہ لڑکا بھی تازہ اور ٹھنڈے پانی کی بوتل لے کر آ گیا۔ یاسر نے پانی پیا اور کچھ منٹ بعد وہ بات کرنے کے قابل ہوا۔

''زاہد اور عظیم کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''زاہد آہستہ چل رہا ہے۔ عظیم اس کے ساتھ ہی تھا۔ ایک چٹان کے پیچھے کچھ سایہ تھا ادھر بیٹھ گئے تھے وہ۔'' یاسر

نے جواب دیا۔

''میں نے کچھ آرام کر لیا ہے۔ اب تم یہاں سامان کے پاس بیٹھو میں چکر لگا کر کسی طرح زاہد اور باقی سامان کے ساتھ آتا ہوں۔'' کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے یاسر کو کہا۔

یاسر کو وہاں بٹھا کر میں واپس چل پڑا۔ اس طرف سے اترائی زیادہ تھی اور سامان کے بغیر چلنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ پانی کی بوتل میں نے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ راستے میں جو بھی پانی دیکھتا وہ پانی مانگتا اور میں انکار نہ کر پاتا۔

اس تجربے سے میں خود گزر چکا تھا اب کیسے انکار کر سکتا تھا۔ لیکن جب بوتل میں بمشکل آٹھ دس گھونٹ ہی باقی رہ گئے تو مجھے شدت سے احساس ہوا کہ پانی کے بغیر اب اتنی دور تک جانا اور عظیم اور زاہد کے ساتھ واپس آنا ممکن نہیں۔ یہ سوچ کر میں نے بوتل کو اپنی شرٹ کے اندر چھپایا اور چلتا رہا۔

آگے جا کر ایک جگہ زاہد اور عظیم دونوں ایک سائے میں بیٹھے نظر آئے۔ لیکن میری توقع سے کہیں زیادہ فاصلہ وہ طے کر چکے تھے۔

''کیوں بھئی۔ آج ادھر ہی رہنے کا ارادہ ہے؟'' میں نے پانی کی بوتل ان دونوں کو دی اور وہیں بیٹھ گیا۔

''بس ہم اٹھ ہی رہے تھے۔ یاسر کہاں ہے؟'' عظیم نے پانی کا ایک لمبا گھونٹ لیتے ہو پوچھا۔

میں نے محسوس کیا کہ ان کی حالت اتنی بری نہیں جتنی ان حالات میں میری ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ سامان اٹھا کر کافی دور تک چل کے آئے تھے۔

''ویسے کافی فریش نظر آرہے ہو، میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہارے حالات بھی برے ہی ہوں گے!'' میں نے اپنا خیال ان پر ظاہر کیا۔

''وہ۔۔ اصل میں۔۔ کچھ لڑکے موٹر سائیکلوں پر آئے ہیں، پنڈی سے۔ گزر رہے تھے تو ہم نے بیگ انہیں دے دیئے۔ سامان کے بغیر چلنے کی وجہ سے تھکاوٹ تو بہت زیادہ نہیں لیکن پیاس کی وجہ سے چلنا مشکل ہو رہا تھا۔'' عظیم نے انکشاف کیا۔

موٹر سائیکلوں پر شمالی علاقہ جات کی سیاحت بھی شوقین لڑکوں میں خاصا پسند کیا جاتا ہے۔ سوات، کاغان اور مری وغیرہ کی طرف تو یہ رجحان کافی زیادہ ہے۔ سکردو تک پنڈی سے موٹر سائیکل ہر آنے کا سن کر مجھے کافی حیرت ہوئی۔ بہرحال یہ ان کی ہمت، شوق اور جذبے کی انتہا تھی جو اتنے طویل اور مشکل راستے پر بھی انہیں یہاں تک لے آئی

تھی۔ وہ لڑکے بھی کچھ ہی فاصلے پر ایک چٹان کے سائے میں کمریں سیدھی کر رہے تھے۔ یقیناً یہ سفران کی توقعات سے زیادہ کمر توڑ ثابت ہوا ہوگا۔

''آرام کافی ہو گیا دوستو! اب چلنے کی فکر کرو۔'' ایک نظر موٹر سائیکل پارٹی پر ڈال کر میں زاہد اور عظیم سے مخاطب ہوا۔

''چلو جی، زاہد صاب اٹھو۔۔ سکردو ہنوز دور است۔۔'' عظیم نے ایک لمبی سانس لی اور کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''ہیں؟ کیا ہوا سکردو کو؟'' زاہد پریشان ہو گیا۔

''ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا۔ تم پہنچو گے تو کچھ نا کچھ ہو ہی جائے گا۔ فی الحال سکردو ابھی بھی دور ہے، ہمت کرو۔۔''

اتنے میں موٹر سائیکلوں کے سٹارٹ ہونے کی آوازیں آئیں۔ چار موٹر سائیکلوں پر مشتمل اس ٹیم نے کوچ کا ارادہ کر لیا تھا۔ چند مرتبہ ایکسیلیٹر دینے کے بعد انہوں نے آہستہ آہستہ ٹوٹی پھوٹی سڑک پر احتیاط سے چلنا شروع کیا۔

میں نے ایک نظر قریب پڑے چار بیگوں پر ڈالی اور آگے ہو کر قریب آنے والے موٹر سائیکل سوار کو اشارے سے روکا۔ سر پر اسکارف باندھے اور دھوپ کا چشمہ لگائے نوجوان نے موٹر سائیکل کو بریک لگائی اور قریب آ کر رک گیا۔ پنڈی سے یہاں تک دھوپ اور گرد میں سفر کرنے کے اثرات اس کے چہرے اور بازوؤں پر نظر آ رہے تھے۔

سلام دعا ہوئی۔ مختصر سا تعارف کروا کر میں نے دوبارہ تعاون کی درخواست کی۔ موٹر سائیکل سوار خاصا خوش مزاج تھا اور حالات دیکھ کر ہماری بے بسی کا اندازہ لگا چکا تھا۔ اتنے میں باقی سوار بھی قریب آ کر رک گئے تھے۔ نہایت خوش دلی سے سامان ان مہربانوں نے اپنے موٹر سائیکلوں پر کسی نہ کسی طرح باندھ لیا۔ یاسر کا حلیہ انہیں بتا کر ہم نے انہیں ممنونیت کے ساتھ روانہ کر دیا۔

وزن کے بغیر اب چلنا مشکل نا تھا۔ بغیر رکے اور تھکے ہم تینوں تھوڑی ہی دیر میں یاسر کے پاس پہنچ گئے۔ جب ہم یاسر کے پاس پہنچے تو سامان وہاں بحفاظت پہنچ چکا تھا۔ ایک دشوار مرحلہ ان بے لوث موٹر سائیکل سواروں نے حل کر دیا تھا۔

کچھ دیر حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہم نے سکردو تک پہنچنے کی تدبیر پر غور کرنا شروع کیا۔ حالات ایسے تھے کہ کسی

انوکھی تدبیر کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔

ٹرکوں کے سائے میں دبکی عوام کم نہیں تھی۔ کافی دیر بعد کوئی ایک آدھ ویگن ٹوٹی سڑک سے بمشکل یہاں تک پہنچ پاتی تھی اور اس کے رکتے ہی ایک ہجوم اس پر حملہ آور ہو جاتا تھا۔ کچھ دیر کے لئے تو ویگن لوگوں میں غائب ہی ہو جاتی تھی۔ کوئی دروازے پر جھپٹتا اور کوئی کھڑکیوں سے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا۔ بمشکل ایک منٹ میں ویگن بھر جاتی تو باقی لوگ چھت پر لگے جنگلے پر سوار ہو جاتے۔ دھکم پیل کے بعد جو لوگ ویگن میں سوار ہونے میں کامیاب ہوتے تھے ان کے چہرے پر ایک معرکہ سر کرنے کے تاثرات جب کے نامراد رہ جانے والوں پر مایوسی چھا جاتی۔

اتنے سامان کے ساتھ یہ دھکم پیل ہمارے بس میں نہ تھی۔ اس کے علاوہ اکٹھے چار لوگوں کی جگہ حاصل کرنے کے امکانات بھی نا ہونے کے برابر تھے۔ کسی بس کا یہاں تک آنا ممکن نہیں تھا۔ اور زیادہ توقعات یہی تھیں کہ سکردو میں لینڈ سلائیڈنگ کی اطلاع پہنچنے پر وہاں کی بسیں شاید روانہ ہی نا ہوئی ہوں۔

ہمارا کسی بھی ذریعے سے فوراً روانگی ضروری تھی۔ لیکن کسی سواری کا انتظام ہی سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ آس پاس کھڑے لوگوں سے مشورہ کیا گیا۔ کسی نے بتایا کہ آبشار تک سڑک ٹھیک نہیں ہے لیکن اس سے آگے گاڑیوں کی آمد و رفت ہے۔

میں اور یاسر فوراً اٹھے اور آبشار کی طرف چل دیئے۔ دس منٹ کی مسافت پر سڑک پر سے پانی گزرتا نظر آیا۔ جس طرف سے یہ پانی آ رہا تھا وہاں پہاڑ میں ایک راستہ سا نظر آتا تھا۔ قریب پہنچے تو سڑک سے کوئی پچاس ساٹھ فٹ پہاڑ کے کٹاؤ میں ایک نہایت بڑی آبشار دکھائی دی۔

نہایت ہی حسین منظر تھا۔ پانی کی پھوار دور تک آ رہی تھی اور گرمی سے نڈھال بہت سے لوگ یہاں نہانے، پانی پینے یا پیر ٹھنڈے کرنے میں مصروف تھے۔ ہماری کیفیت ویسی ہی تھی جیسی صحرا میں بھٹکتے کسی پیاسے مسافر کی کسی اچانک نخلستان تک پہنچنے پر ہو سکتی ہے۔ صرف چند سو فٹ پیچھے تک بھی خشک اور سنگلاخ پہاڑ میں ایسی آبشار کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ تضاد تو قدرت نے انسانی ذہن کو کسی خاص حقیقت کا قائل کرنے کے لئے جگہ جگہ یکجا کر رکھے ہیں۔

ہم نے بھی دل بھر کے ٹھنڈا پانی پیا، منہ ہاتھ دھویا اور کسی حد تک تر و تازہ ہو گئے۔

یہاں بھی ٹرکوں کی ایک لکیر دور تک نظر آ رہی تھی جو سڑک کے کنارے کنارے کھڑے تھے۔ کسی مسافر گاڑی کا

کوئی نام ونشان نہیں تھا۔شاید تمام گاڑیاں جتنے مسافر لے جاسکتی تھیں جا چکی تھیں۔

شام کا وقت ہو چکا تھا اور کچھ ہی دیر میں شام ڈھلنا شروع ہو جانی تھی۔

میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا اور اس مصیبت سے نکلنے کی کوئی ترکیب ڈھونڈ رہا تھا۔ ہمارے جیسے بہت سے پریشان حال مسافر ابھی تک کسی سواری کے منتظر تھے لیکن ٹرکوں کے سوا کسی قسم کی گاڑی کے کوئی آثار نہ تھے۔اچانک میں نے ایک اچھوتا فیصلہ کیا۔

فیصلہ فوری کرنا تھا!

سکردو تک پہنچنے کی مشکل کا صرف ایک ہی حل تھا۔کوئی اور طریقہ ہمیں ان حالات سے نجات نہیں دلا سکتا تھا۔

سفر ہو تو ایسا، سواری ہو تو ایسی

جب یاسر کو میں نے اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو اس نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر ادھر ادھر کا جائزہ لیا، آبشار کے پاس گیا۔ٹھنڈا پانی پیا اور واپس آ کر پھر مجھے دیکھنے لگا۔

شاید وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے قریب بہتے دریائے سندھ میں دھکا دے یا خود چھلانگ لگا ڈالے!

میرا خیال یہ تھا کہ موجودہ حالات میں دستیاب ٹرانسپورٹ صرف ٹرک ہیں۔اور اگر فوری سفر کرنا ہے تو کسی ٹرک پر ہی کرنا ہوگا۔لیکن ٹرک میں دو سے زیادہ لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش نہیں ہوتی اور وہ بھی صرف ڈرائیور کے ساتھ والی اگلی سیٹ پر۔ ہم چار ممبرز تھے، تھکاوٹ بھی تھی اور سفر ابھی بھی طویل تھا۔ٹرک کی رفتار اور وہ بھی اس پیچ وخم کھاتی اونچی نیچی سڑک پر، یقیناً عام حالات میں ایسا سوچنا بھی حماقت ہی سمجھی جاتی۔

یاسر کی نظر میں بھی یہ حماقت ہی تھی، اور وہ احمق نہیں بننا چاہتا تھا۔ بہرحال میں نے یاسر کا بازو پکڑا اور ایک ٹرک کی اوٹ میں خوش گپیاں لگاتے ڈرائیور حضرات کے مجمع میں جا پہنچا۔ان حضرات کے قہقہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے سڑک کنارے کسی ہوٹل میں آرام کا وقفہ گزار رہے ہیں اور کسی قسم کے مسئلے کا سامنا نہیں۔خیر باآواز بلند سلام کیا جس کا جواب بھی بلند آواز میں ملا۔

"آؤ جی___ بیٹھو___ کی حال اے___ کتھوں آئے او"

ڈرائیور حضرات نے نہایت خوش دلی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔

ان کی اور اپنی مشکلات کے حوالے سے چند مناسب جملوں کے تبادلے کے بعد میں اپنے مقصد پر آ گیا اور سکردو تک بغرض سواری ٹرک بک کرنے کی بات کی۔ پہلے تو تمام ڈرائیور حضرات نہایت حیران ہوئے چند نے تو قہقہے بھی لگائے لیکن پھر ہماری سنجیدگی دیکھ کر سوچ میں پڑ گئے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ تمام ڈرائیور سکردو کے بجائے گلگت، راولپنڈی یا دوسرے شہروں کو جانا چاہتے تھے اور بہت دیر

ہوجانے کے باعث کچھ پریشان بھی تھے۔اکثر نے تو صاف معذرت کی ،صرف ایک نسبتاً سنجیدہ اور پختہ عمر کے ڈرائیور نے کچھ آمادگی ظاہر کی۔اب اگلا مرحلہ شروع ہوا یعنی پیسوں کی بات ہوئی۔کرائے کے مطالبہ سنا اور ایک دفعہ تو ہمارے ہوش ہی اڑ گئے!

"آٹھ ہزار روپے"۔ٹرک ڈرائیور نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

یہاں سے سکردو کا بس میں پانچ چھ گھنٹے کا سفر تھا جس کے آٹھ ہزار روپے بہت زیادہ تھے۔

''دیکھیں جی۔۔''

کوئی اور امکان نہ دیکھتے ہوئے ہم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''راستہ تو بہت دیر تک کھلنے کا کوئی امکان نہیں۔یہاں فالتو بیٹھنے،خوراک اور رہنے کے انتظام کے بغیر رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔بہتر یہی ہے کہ کوئی مناسب کرایہ بتائیں اور سکردو چلیں۔ہم سب کے لئے بہتر یہی ہے۔''

ڈرائیور صاحب نے ہماری بات غور سے سنی۔''او جی،سکردو بڑی دور ہے اور ڈیزل کے پیسے بھی دیکھنے ہیں نا ہم نے۔''

''ہم پہلی مرتبہ سکردو نہیں جا رہے۔ہمیں اندازہ ہے کہ کتنا ڈیزل لگے گا۔ہم آپ کو ڈیزل اور آپ کی محنت دونوں کے پیسے دینے کو تیار ہیں لیکن بات نا مناسب نہیں ہونی چاہئے'' ڈیزل کا اندازہ تو خیر مجھے نہیں تھا۔لیکن بارگیننگ کے لئے ایسی کوئی بات کہنا بھی ضروری تھا۔

کچھ دیر بحث اور بعض دوسرے حضرات کے سمجھانے بجھانے اور ہماری حالت کی ابتری کے باعث بالآخر پانچ ہزار روپے میں بات طے ہوگئی۔

ٹرک کو بڑی مشکل سے گڑھوں اور پتھریلی چٹانوں کے بیچ میں سے گزار کر سامان کے پاس لے جایا گیا۔

زاہد اور عظیم نے ہمیں ٹرک پر سوار دیکھا تو بہت حیران ہوئے۔خیر انہیں بھی اپنی کارگزاری سے آگاہ کیا اور پھر سامان سنبھالنے لگے۔

ہمارا ارادہ یہی تھا کہ اپنے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو جو اب تک کسی گاڑی کے انتظار میں تھے ساتھ لے کر جائیں۔اس لئے ہم نے ڈرائیور پر واضح کر دیا تھا کہ ہم دوسرے مسافروں کو بھی بٹھائیں گے۔میں نے اور یاسر نے قریب کھڑے ایک سکردو کے رہائشی سے بات کی اور اسے اپنا پلان بتایا۔تمام مسافر اس وقت کسی بھی بندوبست پر گھر پہنچنے

کو بے تاب تھے۔ان صاحب نے پرجوش انداز میں ہمارا شکریہ ادا کیا اور اس بات پر بھی راضی ہوگئے کہ سکردو کے تمام مسافروں سے وہ کرایہ بھی اکٹھا کرلیں گے۔

''شکر ہے،ورنہ آج تم نے ہم سے کنڈیکٹری بھی کروالینی تھی!'' یاسر نے سکون کا گہرا سانس لیا۔

میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ کافی سارے لوگوں سے کرائے کے پیسے کیسے مانگے جائیں،کنڈیکٹری کا ہمیں کوئی تجربہ نا تھا۔

ان صاحب نے ہجوم کی شکل میں جمع مسافروں کو بلتی زبان میں اس وی وی آئی پی سفر کی دعوت دی جو پرجوش نعروں کے ساتھ قبول کی گئی۔ایک بھگدڑ مچ گئی اور آن کی آن میں صندوق، بیگ، پوٹلیاں اور نجانے کیا کیا کچھ بمع مسافران ٹرک پر لدنا شروع ہوگیا۔

جب تقریباً تمام لوگ سوار ہوگئے تو ہمارے ساتھی نے حسب وعدہ مسافروں سے کرایہ اکٹھا کرنا شروع کیا اور کوئی آدھ گھنٹے کی کوشش سے کل مسافروں سے کرایہ اکٹھا کرلیا گیا۔یہاں سے ویگن یا بس کے ذریعے سکردو تک کا کرایہ اسی روپے بتایا گیا تھا۔ہم نے یہی کرایہ لینے کی درخواست کی۔

اتفاق دیکھئے کہ جب تمام رقم اکٹھی ہوگئی تو معلوم ہوا کہ یہ رقم ٹرک ڈرائیور سے طے شدہ معاوضے سے صرف تین سو بیس روپے کم ہے!یعنی صرف ہمارے حصے کا کرایہ اسی روپے کے حساب سے ہمارے ذمہ آیا۔

پانچ ہزار روپے ٹرک ڈرائیور کے حوالے کر کے ہم نے اسے اللہ کا نام لے کر کوچ کا اشارہ کیا۔

ٹرک کی اگلی سیٹ پر میں،زاہد اور عظیم دبک کر بیٹھے جبکہ یاسر نے ٹرک کے اوپری چھجے پر بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔وہ مناظر سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔یہ خطرناک بھی ہوسکتا تھا اس لئے ہم نے اسے بہت سمجھایا کہ اب شام ہوچکی ہے اور اس علاقے میں دھوپ نہ ہو تو سردی ہوجاتی ہے۔اس کے علاوہ آگے پتھریلے پہاڑ سڑک کے اوپر اس طرح نکلے ہوئے ہیں کہ ایک چھت کی طرح سڑک پر چھائے رہتے ہیں۔

''یار میں نے اس سڑک پر سفر کیا ہوا ہے اور ان سب باتوں کو جانتا ہوں۔جب تک میں برداشت کرسکا میں اوپر ہی بیٹھوں گا"۔یاسر نے ضد کی۔

خیر ٹرک نے چلنا شروع کیا۔

گلگت سکردو روڈ پر سے گزرتے ہوئے دریائے سندھ ڈرائیوروں اور مسافروں سب کے حواس پر چھایا رہتا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک طرف ہمالیہ اور دوسری طرف قراقرم کی سربفلک چٹانوں کے درمیان قید رہنے کی مزاحمت میں اس دریا کا پانی شدید احتجاج کر رہا ہو۔ دریا کی موجیں کسی سمندر کی لہروں کی طرح اوپر اٹھتی تھیں۔ پے در پے مڑتا ہوا پہاڑوں کا یہ سلسلہ دریائے سندھ کو کہیں کہیں ایک تنگ نالے کی شکل میں قید ہونے پر مجبور کرتا نظر آتا تھا۔ ایسی جگہوں پر دریا کا منظر خوفناک ہو جاتا تھا اور اس منظر پر نظریں جمانے کے لئے اچھی خاصی ہمت کرنا پڑتی تھی۔ مختلف زبانوں میں کئی ناموں میں سے اباسین کا نام اس کے صحیح شایان شان ہے۔ یہ دریا واقعی دریاؤں کا باپ کہلانے کا حق دار ہے۔ تبت کی منسرور جھیل سے بحیرہ عرب میں شامل ہونے تک اس دریا کی لمبائی تین ہزار ایک سو اسی کلومیٹر ہے! اس طوالت کی وجہ سے اس کا شمار دنیا کے طویل ترین دریاؤں میں ہوتا ہے۔ ہماری معیشت کی بنیاد کے طور پر اس دریا کے ثمر ہم بے شمار طریقوں سے حاصل کرتے ہیں۔ زراعت اور بجلی کی پیداوار جیسی اہم ترین ضروریات کے علاوہ بھی کئی معاملات میں یہ عظیم دریا ہمارے لئے قدرت کی انمول نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہمارے دائیں طرف دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر ہمالیہ کے پہاڑ نہایت بلندی تک اٹھے ہوئے تھے۔ دریا سے بلند ہوتے چار سے پانچ ہزار میٹر اونچے پہاڑوں کا منظر بھی حیرت ناک تھا۔ کہیں سبز اور کہیں پتھریلے حصوں میں سے اوپر چھپے ہوئے حصوں پر جمی برف سے پگھلتا پانی آبشاروں کی شکل میں دریا میں گر رہا تھا۔

ان خوش منظر پہاڑوں میں کئی جگہ پر سفید رنگ کی موٹی پتلی لکیریں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان لکیروں میں بعض مقامات پر ایسے سوراخ نظر آ رہے تھے جیسے موسمی شکست و ریخت کے باعث شگاف پڑ گئے ہوں۔

میں نے زاہد اور عظیم کی توجہ اس طرف دلائی۔

''یار دیکھنا ذرا، یہ جو سفید لکیریں پہاڑ کے درمیان پھیلی ہوئی ہیں کتنی عجیب ہیں۔ اور مجھے حیرت یہ ہے کہ صرف ان لکیروں میں موسم وغیرہ کی وجہ سے سوراخ سے نظر آ رہے ہیں جبکہ باقی پہاڑ بالکل سلامت ہے۔''

''نہیں جی، یہ سوراخ قدرتی نہیں بلکہ کئے گئے ہیں۔''

کسی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ٹرک ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔

''کئے گئے ہیں؟ کس نے؟ وہاں کون جا سکتا ہے؟'' عظیم نے حیرت اور بے یقینی سے کہا۔

''ادھر سے لوگ پتھر نکالتے ہیں جی۔ بڑا بڑا مہنگا پتھر ملتا ہے ادھر، لوگ پورا پورا مہینہ ادھر رہتے ہیں۔'' ڈرائیور نے ہماری حیرت کے جواب میں بتایا۔

''لیکن اس خوفناک دریا کو پار کر لیتے ہیں لوگ؟ اور یہ تو سیدھی دیوار ہے، اس پر اوپر جانا ناممکن ہے'' زاہد نے انکار میں سر ہلایا۔

''ادھر کہیں کہیں لوہے کی تار کے پل ہیں جہاں سے لوگ پار ہو جاتے ہیں۔ یہ سفید لکیریں جو باریک نظر آتی ہیں کئی کئی فٹ چوڑی ہیں اور لوگ رسے لگا کر اوپر چڑھتے ہیں۔'' ٹرک ڈرائیور کی معلومات ہمارے لئے بالکل نئی تھیں۔

''آپ نے کبھی خود دیکھا ہے کسی کو اوپر چڑھتے ہوئے؟'' زاہد نے پھر سوال کیا۔

''ہمارا کام ہے جی، اس روڈ پر بڑے چکر لگائے ہیں ہم نے۔ کئی دفعہ دیکھا ہے۔ مشینوں سے سوراخ کرتے ہیں اور کبھی اندر رہتے ہیں اور کبھی رسوں سے لٹک کر بھی سو جاتے ہیں۔'' ہماری غیر معمولی دلچسپی نے ڈرائیور صاحب کو اپنی اہمیت منوانے کا موقع فراہم کیا۔

دریائے سندھ کے عین اوپر ایک سیدھی دیوار کی مانند کھڑے ان پہاڑوں پر سے پتھر نکالنے کا تصور رونگھٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اس تیز رفتار دریا کو پار کرنا ہی کچھ کم کارنامہ نہیں چہ جائیکہ اتنی بلندی پر کمند لگا کر یا کسی بھی طریقے سے جانا اور مشینی آلات کے ذریعے سوراخ کر کے وہاں سے پتھر حاصل کرنا! بلاشبہ جان جوکھوں کا کام ہے۔

کچھ دیر تک سڑک کے گڑھوں اور ٹوٹ پھوٹ سے بچ بچا کر ٹرک آہستہ آہستہ چلا اور جب رات کا اندھیرا چھانے لگا تو آگے سڑک کی حالت بھی بہتر ہو گئی۔ لینڈ سلائیڈنگ کی ایسی تخریب کاری ہم نے پہلے کہیں نہ دیکھی تھی۔ ٹرک ڈرائیوروں کی ہمت اور صلاحیتوں کا بھی آج احساس ہو رہا تھا۔

وقت گزاری کے لئے ہم نے ڈرائیور سے باتیں شروع کر دیں۔ زاہد نے کسی خیال کے تحت ٹرک چلانے کے تکنیکی معاملات کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔ ٹرک ڈرائیور نے بتایا کہ ٹرک کو بہت زیادہ احتیاط سے چلانا پڑتا ہے۔ اچانک موڑنے یا زیادہ تیز چلانے سے ٹرک کے الٹنے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ٹرک کی بریک بھی عام گاڑیوں کی طرح فوراً کام نہیں کرتی بلکہ ایک مخصوص طریقے سے اسے روکنا ہوتا ہے۔ ڈرائیور کا کہنا تھا کہ اس گلگت سکردو روڈ سے زیادہ مشکل سڑک ٹرک کے لئے اور کوئی نہیں ہے۔

ہم تو مناظر سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ راستے اور سواری کی وجہ سے لاحق خطرات کے بارے میں بھی سوچ

رہے تھے۔لیکن ٹرک کے پچھلے حصے میں سوار مسافر اس سفر سے جتنا لطف اندوز ہو رہے تھے اس کا اندازہ ان کے قہقہوں اور خوش گپیوں سے ہو رہا تھا۔

کبھی وہ مل کر بلتی زبان کا کوئی گیت گاتے، کبھی کوئی لطیفہ سناتے اور ایک بلند قہقہہ سنائی دیتا کبھی کسی فلم کے ڈائیلاگ مضاحیہ انداز میں ادا کئے جاتے۔راستے میں بارہا سڑک کے اوپر جھکے پتھریلے پہاڑوں سے پانی آبشار کی صورت میں سیدھا سڑک کے درمیان گرتا تھا۔ یہ منظر جتنا خوبصورت تھا اس سے زیادہ دلچسپ ہمارے ہمسفروں نے بنا دیا تھا۔جیسے ہی بس کے چھجے پر سوار لڑکوں میں سے کوئی آبشار کو دیکھتا وہ ایک بلند نعرہ لگاتا۔آبشار کا پانی پھوار اور دھار کی صورت میں سیدھا مسافروں پر گرتا اور ایک مرتبہ پھر قہقہوں اور نعروں کی آواز ابھرتی۔

اگلی سیٹ پر ہوا اور سردی سے بہت حد تک محفوظ ہونے کے باوجود ہم اس سرد پانی کے تصور سے جھرجھری لے کر رہ جاتے۔غرض بلتستانی لوگوں کی خوش مزاجی کا اندازہ ہوا کہ ایک مشکل اور بے آرام سفر میں بھی وہ اتنا ہی مطمئن و مسرور تھے جتنا ہم کسی خوشی کے موقع پر ہوتے ہوں گے۔

پہنچے پہلی منزل پر

رات کا اندھیرا پھیلے کافی دیر ہو چکی تھی جب ہم نے ایک آبادی کے آثار دیکھے۔

صبح سے اب تک کوئی ڈھنگ کی چیز کھانے کو نہیں ملی تھی۔اور افراتفری کے اس عالم میں ہمیں اپنے سامان سے کچھ نکال کر کھانے کا موقع تک نہ ملا تھا۔اب بلب کی روشنیاں نظر آتے ہی ہم نے ڈرائیور بھائی سے کسی ہوٹل پر رکنے کی فرمائش کی۔ڈرائیور کو واقعی اس سڑک اور سڑک کے اطراف واقع ہوٹلوں کا وسیع تجربہ تھا۔لہٰذا چند ہی منٹ بعد سڑک کے بائیں طرف جا بجا کھڑکیوں والے ایک ہوٹل کے کھلے احاطے میں ٹرک رک گیا۔

ٹرک میں لدے مسافروں کے غلغلہ آمیز نعروں نے ہمارے اس اقدام کی توثیق کی اور دھڑا دھڑ چھلانگیں لگا کر ٹرک سے اترنے لگے۔ہم بھی ہوٹل میں داخل ہوئے اور ہوٹل کی چارپائیوں پر بلا تکلف لیٹ گئے۔اب تک کی مشقت کے بعد سکون و آرام کے یہ لمحات میسر آئے تھے۔

"سر کیا کھائے گا؟"

آواز سن کے ہم نے بولنے والے کی طرف دیکھا۔

ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرنے والا یہ ایک مخصوص تبتی نقش و نگار والا بلتستانی تھا۔

ہوٹل کی چارپائیوں پر بے تکلفی سے لیٹے ہمیں کچھ ہی دیر ہوئی تھی اور اس وقت کسی بھی بات کا جواب دینے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ہم چاروں ہی خاموش رہے، ہماری تھکاوٹ اس وقت صرف نیند کا تقاضا کر رہی تھی۔

دل چاہا کہ کہیں

"بابا، ہم کچھ کھائے گا یا نہیں، ابھی تم ہمارا سر نا کھاؤ"

لیکن کچھ نہ کچھ کھانا بھی نہایت ضروری تھا کیونکہ لینڈ سلائیڈنگ میں بوجھ اٹھا کر چلنے اور تمام دن خالی پیٹ رہنے

کے بعد جسم میں توانائی ختم ہو چکی تھی۔ اب ایک نقاہت کی کیفیت محسوس ہو رہی تھی جس کا حل فوری طور پر ضروری تھا۔

"کیا ملے گا؟" میں نے پوچھا۔

جواب میں اس نے مرغی اور دال کا نام لیا۔ اب تک راستے کے ہوٹلوں میں کھانے کا کچھ اچھا تجربہ نہ تھا اس لئے میں نے ایک پلیٹ مرغی اور ایک پلیٹ دال کا کہہ دیا کہ چلو جتنا ہو سکے زہر مار کر ہی لیں۔

چند منٹ میں کھانا ہمارے سامنے تھا۔ مرغی کے سالن اور دال کا رنگ بتا رہا تھا کہ کھانا صفائی سے اور کسی ماہر باورچی کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔ لکڑی کے تنور کی گرم گرم روٹیوں کی مہک نے بھوک کے دبے ہوئے احساس کو جیسے جھنجھوڑ ڈالا۔ ایک ایک نوالہ لینے کے بعد پہلے تاثر کا ثبوت مل گیا اور ہم چاروں کے ہاتھ نہایت تیزی سے روٹی پھر سالن اور منہ تک کے چکر لگانے لگے۔ کچھ ہی دیر میں پلیٹیں اس طرح صاف ہو گئیں کہ جیسے بالکل نئی ہوں۔

کھانا پھر منگوایا گیا اور پھر منگوایا گیا۔ نہایت اچھے ذائقے کی حامل چائے پی کر اوسان کافی حد تک بحال ہو گئے۔ لیکن معدے میں خوراک کی وافر مقدار نے اعصاب اور آنکھوں پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا اور پہلے سے بھی زیادہ نیند آنے لگی۔ اب آنکھیں کھلی رکھنے کے لئے اچھے خاصے جتن کرنے پڑ رہے تھے، لہٰذا بہتر یہی سمجھا کہ فوراً سفر کا آغاز کر دیا جائے نہیں تو سب یہیں سو جائیں گے۔

ڈرائیور بھائی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا جو خود بھی اسی انتظار میں تھے۔

یاسر کو بھی سمجھ آ چکی تھی کہ اب تک تو کھلی ہوا اور مناظر سے لطف اندوز ہونے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔ لیکن اس سے آگے اب یہ اس کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے اب اس نے بھی ہمارے ساتھ آگے بیٹھنے کی فرمائش کی۔

جگہ پہلے ہی تنگ تھی، ہم تینوں نے رضا کارانہ طور پر ٹرک کے پچھلے حصے میں سوار ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن یاسر نے اصرار کیا کہ چاروں کسی نہ کسی طرح آگے ہی بیٹھیں گے۔

صرف دو لوگوں کی جگہ پر کس طرح چار لوگ سوار ہوئے، اس کا ماجرا رہنے ہی دیجئے تو بہتر ہے۔ لیکن اس سفر نے ہماری کمروں پر جتنا اثر ڈالا وہ آج بھی رہ رہ کر اس رات کی یاد دلاتا ہے۔ چاروں کے اکٹھا بیٹھنے سے یہ ضرور ہوا کہ ہنسی مذاق اور گپ شپ میں سفر نسبتاً دلچسپ اور وقت گزارنے کے لئے ایک زبان کا اضافہ ہو گیا۔

رات کی اس تاریکی میں ٹرک اپنی کم رفتار کے ساتھ چلتا رہا۔ کئی مقامات پر چڑھائی اتنی شدید تھی کہ ٹرک پہلے گیئر

میں نہایت سست رفتاری سے چڑھتا تھا۔ اور یہ کوئی ایک یا دو چڑھائیوں کی بات نہیں کل راستہ ہی چڑھائی پر مشتمل تھا۔ کہیں کہیں چند میٹر کی سیدھی یا نسبتاً ڈھلوانی سطح آتی تھی۔ تمام راستے ہمیں کسی بھی گاڑی کا سامنا نہیں ہوا۔ یقیناً سکردو میں لینڈ سلائیڈنگ کی اطلاع پہنچ چکی تھی اور کوئی بیوقوف ہی اس اطلاع کے بعد سفر پر نکلتا۔

نہایت تکلیف میں بیٹھنے کے باوجود نیند سے آنکھیں بند ہونے لگتی تھیں لیکن ڈرائیور بھائی کا مطالبہ تھا کہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر کوئی سوئے نا۔ ہمیں بھی اس بات کی اہمیت کا بخوبی اندازہ تھا کہ رات کے وقت دریائے سندھ کے کنارے پے در پے موڑوں پر مشتمل اس پہاڑی سڑک پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر سونا کتنا خطرناک ہو سکتا ہے اور ہم اتنے مسافروں کے ساتھ اپنی جان کا رسک لینے کو قطعاً تیار نہ تھے۔

ٹرک اور رات تقریباً ہم رفتار سرک رہے تھے۔ سفر کی ان آزمائشوں کا کبھی خواب میں تصور آیا تھا اور نہ ہی کبھی ایسے کسی سفر کے بارے میں پڑھا سنا تھا۔ شمالی علاقہ جات کی سیاحت کا شوق جو قیمت اس سفر میں وصول کر رہا تھا اس سے پہلے کبھی ادا نہ کی تھی۔

نگر میں راکاپوشی سے واپسی پر ایک مرتبہ مسلسل تیرہ چودہ گھنٹے کا پیدل سفر ہم نے کیا تھا، رات کے اندھیروں اور خراب موسموں میں خطرناک راستوں پر ہم نے منزلیں طے کی تھیں۔ لیکن سارے دن کی مشقت کے بعد ایک غیر آرام ٹرک میں اس سفر نے ہمیں حقیقتاً توڑ کر رکھ دیا تھا۔

لیکن پھر بھی آنے والے دنوں اور نظاروں کا تصور ان مشکلات پر حاوی تھا۔ گھر سے نکلنے سے پہلے ہی ہم سب کو احساس تھا کہ جس سفر پر ہم جا رہے ہیں، اس میں ہمارا ہر قدم ہمیں کسی نئی مشکل میں ڈال سکتا ہے۔ ابھی تو راستے میں آنے والی یہ پہلی قابل ذکر مشکل تھی۔ اہم یہ تھا کہ جس منزل کی طرف ہم جا رہے ہیں اس تک پہنچنے میں ہم کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں۔ ہمارے لئے اب تک یہی کافی تھا کہ ہم ان حالات میں بھی آگے ہی جا رہے تھے پیچھے نہیں۔ اور اب پہاڑوں کے سیاہ ہیولوں کے اس منظر میں ٹرک کی ہیڈ لائیٹوں کی روشنی، بل کھاتی سڑک کے کنارے جب کسی سنگ میل پر پڑتیں تو ہم خود کو سکردو کے دروازے سے قریب تر پاتے۔

پھر آدھی رات بھی گزر گئی۔

باتوں کا کوٹہ ختم ہوتا جا رہا تھا اور اعصاب کی تھکاوٹ اب زبانوں پر بھی اثر انداز ہونا شروع ہو چکی تھی۔ شدید کوشش کے باوجود میری آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب میں سو گیا۔

جب آنکھ کھلی تو یاسر اور عظیم باتیں کر رہے تھے جبکہ زاہد سر ایک طرف ڈھلکائے نیند کے عالم میں تھا۔ سامنے شیشے سے باہر ایک سیدھی سڑک کے اطراف سٹریٹ لائٹیں جل رہی تھیں۔

دماغ نے کچھ کام کرنا شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ ٹرک اب دریائے سندھ کا مشہور پل پار کر کے سکردو کی حدود میں داخل ہو چکا ہے اور ہم کچورا کے علاقے سے نکل کر سکردو ائیر پورٹ کے سامنے سے گزر رہے ہیں۔ یہاں سے سکردو کے یادگار چوک تک زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے کا سفر تھا اور اب ٹرک بھی سیدھی سڑک پر بہتر رفتار سے دوڑ رہا تھا۔

نہایت مستقل مزاجی سے دی جانے والی ہماری دستکوں نے پہاڑوں کے سینے میں واقع اس دل کا دروازہ بالآخر کھول ہی دیا تھا!

پھر وہ لمحہ بھی آ ہی گیا جب ہم سکردو کے وسط میں واقع یادگار چوک میں تعمیر کئے گئے مینار سے بائیں طرف واقع بسوں کے ایک خالی احاطے میں اترے۔ ایک طویل اور پر مشقت سفر کے اختتام کے احساس سے زیادہ سر بفلک پہاڑوں کے درمیان آباد سکردو پہنچنے کی خوشی ہم چاروں کے چہروں پر تھی۔

صبح ہونے ہی والی تھی اور دنیا کے مشہور ترین پہاڑی شہر کا موسم سرد تھا۔ اردگرد کے پہاڑوں پر جمی برفیں اندھیرے میں بھی چمک رہی تھیں۔

ٹرک سے باہر آئے تو ٹھنڈک نے ایک دفعہ تھرا دیا۔ یہاں سویٹر یا جیکٹ نکالنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

مسافر ٹرک سے اترے اپنا سامان اٹھایا اور سلام کر کے اندھیری گلیوں میں غائب ہوتے چلے گئے۔ ٹرک ڈرائیور بھی ہم سے گلے مل کر اور ہاتھ ملا کر اپنے کسی اڈے کی طرف روانہ ہو گیا اور صرف ہم باقی رہ گئے۔

سڑکیں سنسان اور ہمارے سوا کسی ذی نفس کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔ فوری طور پر کسی آرام دہ اور صاف ستھری رہائش کی تلاش ضروری تھی۔ سوال یہ تھا کہ یہ قربانی کون دے کہ رات کے اس آخری پہر اردگرد کے ہوٹلوں میں جا کر کسی کو جگا کر اور کمروں کا جائزہ لے کر آئے۔ اندھیرا گہرا ہونے کے بعد سکردو آنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے اس لئے ہوٹل بھی رات دس گیارہ بجے کے بعد بند ہو جاتے ہیں۔ اندر والے اندر اور باہر والے باہر!

ہمت تو سب کی ہی جواب دے چکی تھی اور سب ایک دوسرے کو اس مشن پر نکلنے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ زاہد نے تجویز دی کے دو دفعہ ٹاس کی جائے اور ہارنے والے ہوٹلوں کی جانچ پڑتال کے سزاوار قرار

پائیں۔ تجویز معقول تھی، ایک سکہ نکالا گیا، میرے اور زاہد جبکہ یاسر اور عظیم کے درمیان ٹاس کی گئی۔

میں اور یاسر جیت گئے لہٰذا عظیم اور زاہد پیر پٹختے ہوٹل کی تلاش میں نکل گئے۔

ہم دونوں بسوں کے اس خالی احاطے کے ایک کونے میں لکڑی کے ایک ٹھیلے پر اپنے سامان کے پاس بیٹھ گئے۔

سردی سے حفاظت کے لئے میں نے ایک چادر نکالی اور ہم دونوں نے اوڑھ لی۔

چند ساعتوں کی خاموشی کے بعد میں نے یاسر سے بات کرنا چاہی، لیکن جواب ندارد۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی لیکن اپنی گردن کے سوا کوئی اور متحرک چیز دور دور تک محسوس نہ ہوئی۔

موقع اچھا تھا، میں نے بھی یاسر سے سبق سیکھا اور خوانچہ فروش کے اس ٹھڑے پر جہاں دن کی روشنی میں وہ نجانے کیا بیچتا ہو گا، گھوڑے بیچے اور مزے سے سو گیا۔

اب کہاں جائیں!

خانہ بدوشی کی نیند کا بھی اپنا ہی مزا ہے۔ نہ سر پر چھت اور نہ چھپنے کو چار دیواری، نہ بستر کی فکر اور نہ ہی چوری کا کھٹکا۔

آنکھ لگی تو گزرے ہوئے واقعات کی فلم خواب میں بھی چلتی رہی۔

کبھی لگتا کہ کوئی بہت بڑی چٹان پہاڑ سے لڑھک کر ہم پر گر رہی ہے اور بچنے کے لئے ہم ٹرکوں کے نیچے گھس رہے ہیں۔ کبھی لگتا کہ دریائے سندھ کی تند و تیز لہروں میں بہتا چلا جا رہا ہوں اور کمر پر لدے رک سیک کی وجہ سے تیرا بھی نہیں جا رہا۔

اچانک نہایت زور کا زلزلہ محسوس ہونے لگا۔

بہت دیر تک میں اسے بھی خواب کا ایک حصہ ہی سمجھتا رہا لیکن جب زلزلے کی شدت میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہونا شروع ہوا تو میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔

آنکھیں کھولنے کے بعد بھی جسم کی لرزش کم نہ ہوئی۔ مزید ایک دو جھٹکوں کے بعد جب احساسات نے کام کرنا شروع کیا تو دیکھا کے عظیم مجھے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا ہے اور زاہد پتہ نہیں کیا کیا بولے چلے جا رہا ہے۔

خیر زاہد اور عظیم کی بات سمجھنے کی کوشش کی۔

معلوم ہوا کہ پون گھنٹے کی جھک ماری کے بعد بھی کسی رہائش کا بندوبست نہیں ہو سکا۔ نا تو کسی نے گھنٹی کی آواز پر کان دھرنا گوارا کیا اور نہ ہی دروازے کھٹکھٹانے کو درخور اعتنا سمجھا۔ اہل سکردو اس قدر گہری نیند سوتے ہیں اس کا ہمیں آج اندازہ ہوا۔

اب صبح کا اجالا پھیل رہا تھا اور امید تھی کہ شاید کچھ دیر میں کوئی سحر خیز میزبان ہم بے وقت مہمانوں کو بمع سامان قبول

کرنے پر رضامند ہو ہی جائے۔

سردی تو تھی ہی، لیکن اس طلوع ہوتی صبح میں سکردو کی اس دلآویزی کا نظارہ بھی شاید کسی کسی مسافر کی قسمت میں ہی ہو۔

سرمئی اور بھورے، سیدھے آسمان کی طرف بلند ہوتے پہاڑوں کے درمیان ایک وادی اور پہاڑوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ پھیلتی نیلی روشنی ابھی اندر آنا ہی چاہتی ہے۔ آسمان صاف اور پہاڑوں کی بلندیوں پر جمی برف کی سنہری چمک۔ بھورے پتھریلے ان پہاڑوں کے بیچ نیا دن طلوع ہوتا دیکھنا گویا ایک نئے جہان سے آشکار ہونا تھا، دھول دھوئیں اور بھیڑ بھاڑ کی دنیا سے دور کسی ان دیکھے، ان سنے سیارے پر۔

کچھ روشنی ہوئی تو میں نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ جس احاطے پر اس وقت ہم نہایت بے تکلفی سے قبضہ کئے بیٹھے تھے یہ بسوں کا ایک چھوٹا سا اڈہ تھا۔ ہم لکڑی کے جس ٹھیلے پر بیٹھے ہوئے تھے یہ اس اڈے کے بیرونی نکڑ پر تقریباً سڑک کے کنارے قائم گیا تھا۔ چار پانچ بسوں کی گنجائش کے اس مستطیل اڈے کے اطراف بند شٹر والی دکانیں تھیں۔

زاہد احاطے کے اندر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ وہ ایک دکان کے سامنے رکا اور آہستہ آہستہ اس کے قریب ہونے لگا۔ میں یہی سمجھا کہ یہ کوئی دکان ہے جو یقیناً اس وقت بند ہے۔ زاہد کی ایک بند دکان میں دلچسپی کی مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔ زاہد نے میری طرف دیکھا، میں اٹھا اور زاہد کے پاس چلا گیا۔ زاہد کی توجہ جس چیز پر تھی اس نے مجھے بھی غور کرنے پر مجبور کیا۔

رات کے اندھیرے میں ہمیں نہ یہ نظر آیا اور نہ ہی ہمیں یہ اندازہ ہو سکا کہ نہایت قریب بلکہ ہماری بغل میں بھی ایک ہوٹل موجود ہے۔

یہ ایک ایسا ہی ہوٹل تھا جو شہروں میں عام طور پر سڑکوں کے کنارے ہوتے ہیں۔ باہر سے لکڑی کے چوکھٹوں میں شیشے لگے ہوئے تھے اور اندر اندھیرا تھا۔ ہم نے شیشوں سے اندر جھانکا۔ مکمل سکوت تھا لیکن صبح کی ہلکی روشنی میں محسوس ہوا کہ چند لوگ شاید چارپائیوں پر سو رہے ہیں۔

زاہد نے شیشے کو پہلے ہلکا اور پھر ذرا زور سے کھٹکھٹایا۔ چند ساعتوں بعد کسی کے اٹھنے اور چپل گھسیٹنے کی آواز آئی پھر بلب کی روشنی نے اندر کا منظر بھی ہم پر واضح کر دیا۔

شیشے کا دروازہ کھلا اور ہم دونوں بغیر پوچھے غڑاپ سے اندر داخل ہو گئے۔ گرم ماحول اور کرسیوں پر بیٹھ کر ہم نے ہکا بکا کھڑے دروازہ کھولنے والے کی طرف دیکھا۔

درمیانے قد کا چھوٹی چھوٹی بکھری داڑھی اور بالوں سوالا یہ ایک بلتی شخص تھا جو ہمیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ فیصلہ نا کر پا رہا تھا کہ کمال بدتمیزی سے منہ اندھیرے نازل ہونے والے ان انسانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

کسی نتیجے پر نہ پہنچنے پر آخر اس نے پوچھا۔

" کہاں سے آیا سر؟"

''پنڈی سے، ناشتے وغیرہ کا بندوبست ہے آپ کے پاس؟'' زاہد نے کسی لمبے جواب کے بجائے الٹا سوال داغا۔

''کونسا گاڑی سے آیا؟''

''ٹرک سے، ناشتے میں کیا ہے اور کیا آرام کے لئے بھی جگہ ہے آپ کے پاس؟''

زاہد کسی بحث وتمحیص میں نہیں پڑنا چاہ رہا تھا اور اس کے بچے کھچے حواس پر گرما گرم ناشتہ اور لمبی تان کر سونا ہی چھایا ہوا تھا۔

زاہد کے ان احساسات کو میں تو سمجھ سکتا تھا لیکن ایسے جوابات دروازہ کھولنے والے کی تسلی کے بجائے شکوک و شبہات میں اضافے کا باعث بن سکتے تھے۔

اس سے پہلے کے سکردو کی اس سہانی صبح ہم کسی تنازعہ کا شکار ہوتے اور پھر اسی تھڑے پر پہنچا دیے جاتے، میں نے مختصر ترین الفاظ میں گاڑیوں کی قلت کے باعث لینڈ سلائیڈنگ سے یہاں تک بذریعہ ٹرک آمد کا ماجرا بتایا۔

بات سمجھ آنے پر اس نے سر ہلایا اور ہمدردی سے بولا

''بہت خرابی ہوا سر، ادھر بھی بہت لوگ پھنسا ہوا ہے۔ سب راستہ کھلنے کا انتظار کرتا ہے۔ آپ آرام سے بیٹھو میں چولہا جلائے گا اور انڈہ پراٹھا بنائے گا۔''

کسی چھت کے نیچے نسبتاً باعزت آرام گاہ اور ناشتے کا مژدہ ملنے پر میں نے سکون کا سانس لیا۔

زاہد کرسی پر ڈھیر ہو چکا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اب اسے حرکت کرنے کا کہنا بے وقوفی ہی ہوگا۔ اس لئے خود ہی باہر جا کر یاسر اور عظیم کو ایک عارضی ٹھکانے کی خوشخبری سنائی۔ اس کے بعد کسی نہ کسی طرح سامان گھسیٹ ہم سب مختصر سے اس ہوٹل کی مخدوش کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

ہوٹل کے اس ہال کا منظر بھی دلچسپ تھا۔

دروازے کے سامنے راستے کے ایک طرف دیوار تھی جس میں ایک چوکور سوراخ تھا۔ یہ سوراخ جو دوسری طرف واقع کچن سے کھانا وغیرہ حاصل کرنے کے کام آتا ہوگا۔ راستے کے اس طرف چار پانچ میزیں تھیں جن کے گرد لکڑی کی پرانی کرسیاں رکھ کر بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ بیٹھنے پر یہ کرسیاں کڑکڑاتی تھیں۔ میزوں پر رکسین منڈھ کر صفائی اور خوبصورتی کا بندوبست کیا گیا تھا۔

جس چیز نے ہم چاروں کو متاثر کیا وہ اندرونی دیوار کی لمبائی کے ساتھ ساتھ لکڑی کا ایک طویل تخت تھا۔ اس تخت پر متعدد کمبل اور لحاف تھے جن کے اندر یقیناً سونے والے بھی تھے۔ فوراً دماغ میں ایک سرائے کا تصور ابھرا جہاں تھکے ہارے مسافروں کو کم قیمت شب گزاری کی سہولت فراہم کی گئی تھی۔

اتنی دیر میں ہوٹل کا چولہا جل چکا تھا اور چوکور سوراخ سے چائے کی مہک ہوٹل کے ہال میں پھیل چکی تھی۔

اب ہوٹل کے دیگر ملازم بھی بیدار ہو چکے تھے اور تخت پر سوئے حضرات بھی ہماری باتوں اور کچن کی کھٹ پٹ کی آوازوں سے جاگنے لگے۔

ایک طرف کچھ جگہ خالی ہوتے ہی ہم نے وہاں قبضہ کر لیا اور جوتے اتار کر اوپر ہو کر بیٹھ گئے۔ کچن سے پراٹھوں اور انڈوں کے تلے جانے کی خوشبو بھی آنے لگی تھی۔ آٹھ دس منٹ بعد ہمیں ناشتہ بھی مل گیا۔

ناشتے کے بعد ہم نے کچھ دیر آرام کی شدید ضرورت محسوس کی۔ ہوٹل کے مالک سے بات کی اور اسی تخت پر کچھ دیر نیند کی۔

ایک ڈیڑھ گھنٹہ کچی پکی نیند سونے کے بعد اٹھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ایک تو ہوٹل میں لوگوں کی آمد و رفت اور ہنسنے بولنے کی آوازیں بے آرامی کے لئے بہت تھیں۔ پھر یہ ہوٹل واقع ہی سکردو کے اڈے کے اندر تھا جہاں اب چھوٹی بڑی گاڑیوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ خیر اس جسمانی تھکاوٹ کو اتارنے کے لئے تو کم از کم ایک رات کی نیند چاہئے تھی۔ اس لئے جتنا آرام مل گیا تھا اسی پر قناعت کرنا پڑا۔

منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد ہم پھر ایک میز پر جمع ہو گئے اور پھر اپنے منصوبے پر غور کرنے لگے۔

راستے کی رکاوٹوں نے ہمیں اپنے پروگرام سے کم از کم ایک دن لیٹ کر دیا تھا۔ ابھی ہمیں خریداری، پورٹروں کے بندوبست اور جیپ کے علاوہ آگے کے حالات کے بارے میں تازہ معلومات بھی درکار تھیں۔ ان کاموں کے لئے

بھی ہمیں اچھی خاصی بھاگ دوڑ کرنی تھی۔اوراس بھاگ دوڑ کے لئے مزید وقت درکار تھا۔

اس وقت جب ہم نامساعد حالات کا سامنا کرتے ہوئے صرف آرام کی تلاش میں تھے،ہمیں سکردو کو چھوڑ کر اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہو چکا ہونا چاہئے تھا۔

اب ہم نے اس ہنگامی میٹنگ میں جلد از جلد روانگی کو ممکن بنانے کے سوال پر غور کیا۔عظیم کے سکردو میں بعض معروف ٹریکنگ اور ایکسپی ڈیشن سے متعلقہ لوگوں سے تعلقات تھے۔اس وقت ہمیں کسی ایسے تعلق کی تلاش تھی جو ہمیں درست مشورہ دے سکے۔

''عظیم صاحب،آپ کسی قریبی ٹیلی فون سے فوراً اپنے دوستوں سے رابطہ کریں۔اگر وہ مصروف ہوں تو ہم ان سے جا کر مل لیں گے۔''

''جی،بالکل ٹھیک ہے۔میں ابھی کسی پی سی او سے بات کرتا ہوں''عظیم فوراً اٹھا اور باہر نکل گیا۔

''یار،باقی سامان کی خریداری کا کیا کرنا ہے؟''یاسر نے یاد دلایا۔

''ہاں،سامان تو لینا ہی ہے۔مسئلہ یہ ہے کہ ساتھ ہی پورٹروں کا بھی بندوبست ہو جائے تا کہ سامان کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔''میں چاہتا تھا کہ پورٹروں سے معاملہ نمٹانا زیادہ ضروری ہے تا کہ ہم اسی کے مطابق سامان خریدیں۔ سامان خریدنے اور بعد میں پورٹروں کا بندوبست کرنے میں ہمارے لئے سامان سنبھالنے کا مسئلہ ہو سکتا تھا۔

''ٹھیک بات ہے۔میں تو کہتا ہوں سب کی ڈیوٹیاں لگا دو۔ایک کام کو سب مل کر کریں گے تو دو دن تو ادھر ہی لگ جانے ہیں۔''زاہد جو کافی دیر سے خاموش تھا ایک دم بول اٹھا۔

''واہ بھئی واہ!سکردو آ کر تو تمہارا دماغ ٹھیک ہو گیا ہے۔بڑی پتے کی بات کی بھئی''یاسر نے زاہد کو چھیڑا۔

''زاہد نے بہت اچھی بات کی ہے۔ہمیں وقت ضائع کرنے کے بجائے حرکت کرنی چاہئے۔عظیم کو آنے دو ممکن ہے اس کے کسی تعلق سے ہمارا کام آسان ہو جائے۔''میں نے یاسر اور زاہد کی متوقع جھڑپ سے بچنے کے لئے تیزی سے کہا۔

جلد ہی عظیم ہوٹل کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔

''کوئی بات بنی؟''یاسر نے اس کے بیٹھنے سے پہلے ہی پوچھا۔

''یار،آج کل بہت رش ہے۔میں نے تو جسے بھی فون کیا پتہ چلا کہ وہ اوپر گیا ہوا ہے کسی ٹیم کے ساتھ۔''عظیم نے

مایوسی سے سر ہلایا۔

''یار،میں نے کہا نا کہ اٹھو سب باہر نکل کر خود کچھ کرو''زاہد نے پھر اپنی بات پر زور دیا۔

باہم مشورے کے بعد ہم نے یہ طے کیا کہ کم سے کم وقت میں تیاریاں مکمل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ پورٹروں کا بندوبست اور سامان کی خریداری بیک وقت کی جائے۔عظیم اور زاہد کے ذمے سامان کی خریداری جبکہ پورٹروں کی تلاش یاسر اور میری ذمہ داری ٹھہری۔ہوٹل والوں کو سامان کا خیال رکھنے کا کہہ کر ہم باہر نکل آئے۔

بازار میں نکل کر اس بات کا اندازہ مشکل تھا کہ کس سے پورٹروں کے بارے میں پوچھا جائے۔گھومتے پھرتے میں اور یاسر سکردو کے پرانے بازار کی طرف نکل گئے۔ایک گلی میں ٹریکنگ اور کوہ پیمائی وغیرہ کا پرانا سامان نظر آیا۔ گلی میں داخل ہوئے تو دیکھا کے کئی دکانوں پر تقریباً ہر طرح کا سامان دستیاب ہے۔کیمپ،سلیپنگ بیگ،رک سیک،ٹریکنگ بوٹ،کریمپن،رسیاں،ٹارچیں،گیٹرز،کیرابینر۔ٹریکنگ تو ٹریکنگ یہاں سے کوہ پیمائی کے لئے بھی پوری ٹیم کا سامان خریدا جا سکتا تھا۔نیا بھی اور استعمال شدہ بھی۔

مختلف نوعیت اور ملکوں کا یہ سامان باوجود ہماری کوشش کے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔اگر ہم جلدی میں نا ہوتے تو شاید تمام دن اسی بازار میں گزار دیتے۔پہاڑوں سے محبت رکھنے والوں کے لئے اس سامان میں دلچسپی ایک قدرتی امر ہے۔

ایک دکان پر کچھ چیزوں کی قیمتیں وغیرہ معلوم کرتے کرتے اچانک میں نے پورٹروں کا تذکرہ کیا۔

''پورٹر مل جائے گا نا۔کدھر جاتا ہے آپ؟''دکان کا مالک ایک نوجوان بلتی تھا۔

''ہم نے کنکورڈیا جانا ہے۔آپ کسی پورٹر کو جانتے ہیں جو جلدی ہم سے مل سکے؟''

''ادھر ست پارہ میں بہت پورٹر رہتا ہے۔آپ کو ضرورت ہے تو میں کسی کو بھیج دے گا۔آپ کون سا ہوٹل میں ہے؟''

اس سوال کا جواب ہمارے لئے مشکل تھا کیونکہ ہم تو کسی ہوٹل میں نہیں ٹھہرے تھے۔وہ تو ایک ریسٹورنٹ یا زیادہ سے زیادہ سرائے تھی۔اس کے علاوہ ہم اس سرائے کا نام بھی نہیں جانتے تھے۔لیکن اب کسی جگہ کا تو بتانا ضروری تھا۔

اس موقع پر یاسر نے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور جگہ سمجھانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

''ہاں،وہی اڈے کے اندر شیشوں والا ہوٹل۔آپ مہربانی کر کے جلدی سے پورٹروں کو وہاں بھجوا دیں۔ہم انتظار

کررہے ہیں۔‘‘

اگر پورٹروں کا جلدی بندوبست ہو جاتا تو یہ ہمارے لئے خاصی بڑی کامیابی تھی۔خاصی امید کے ساتھ ہم فوراًاسی سرائے میں واپس آ گئے۔

تھوڑی دیر میں زاہد اور عظیم بھی کچھ تھیلے اٹھائے پہنچ گئے۔

’’ہماری ضرورت اور حساب کے مطابق تو سارا سامان پورا ہو گیا ہے۔اب پورٹروں کا کچھ پتہ چلے تو ان کا راشن باقی ہے۔‘‘زاہد اور عظیم کافی پوری احتیاط کے ساتھ ضروری سامان کی خریداری کر لائے تھے۔

’’پورٹروں کا کچھ ہوا؟‘‘عظیم نے پوچھا۔

ہم نے انہیں کوہ پیمائی کی دکان کے مالک سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔

’’کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا۔امید ہے وہ آ جائیں گے۔‘‘میں نے امید ظاہر کی اور ہم سب دروازے پر نظریں جما کر بیٹھ گئے۔

زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دولڑکے اندر داخل ہوئے اور ہوٹل کے مالک سے بلتی زبان میں کچھ پوچھنے لگے۔

مالک نے ہماری طرف اشارہ کیا۔کچھ جھجکتے ہوئے وہ دونوں ہماری طرف آ گئے۔

’’آپ کو پورٹر چاہئے؟‘‘

’’ہاں،کیا آپ پورٹر ہیں؟‘‘میں نے پوچھا۔

’’جی سر،آپ کہاں جاتا ہے،کنکورڈیا؟‘‘۔۔۔

’’ہاں،ادھر بیٹھو اور کنکورڈیا کے راستے کا کچھ بتاؤ۔‘‘

ہم نے پورٹروں سے معلومات لینا شروع کیں۔

’’جیپ داسو تک جائے گا آگے راستہ بند ہے اور دو دن کا پیدل سفر ہے اسکولے تک‘‘

یہ مزید پریشان کن خبر تھی۔راستہ بند ہے تو اب کہاں جائیں!

اتنے دن ہمارے پاس نہیں تھے کہ چار دن یعنی دو دن جاتے ہوئے اور دو دن واپسی پر،کی مزید دیر کر سکیں۔سب کی مصروفیات اور ذمہ داریاں اس بات کی اجازت نہ دیتی تھیں۔خیر اس کے باوجود ہم نے اپنے مذاکرات جاری رکھے۔اس امید پر کہ شاید کل تک راستہ درست ہو جائے یا ہم کوشش کر کے زیادہ سفر طے کریں اور کم وقت میں اپنی

منزل سے ہو کر واپس آ جائیں۔

’’اچھا یہ بتاؤ کہ آپ ہم سے کتنے پیسے لو گے؟ دیکھو ہم سے بھائیوں والی بات کرنا ہم انگریز نہیں ہے۔‘‘یاسر نے سب سے اہم سوال پوچھا۔

’’دیکھو سر،کنکورڈیا تک بیس پے سٹیج ہے۔چار ریسٹ ہے۔ابھی راستہ بند ہے تو چار سٹیج اور ہوگا۔دو جانے کا اور دو آنے کا۔اٹھارہ دن لگے گا داسو سے واپس داسو تک۔‘‘چھوٹے قد والے پورٹر نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

’’یار،تم نے تو چوبیس پے سٹیج بنا دئے۔اسکولے سے کنکورڈیا تک اٹھارہ پے سٹیج ہیں۔اور دیکھو ہم نے تیز چلنا ہے اور ریسٹ نہیں کرنا۔ہوسکتا ہے ہم ایک دن میں دو پے سٹیج چلیں۔اس سے تمہارا ابھی وقت بچے گا۔‘‘عظیم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

’’سر بیس پڑاؤ ہے۔دیکھو۔اسکولے سے کورفون،جولا،بردومل،پائیو،للّی گو،کھابر سے،اردوکس،گوروون،گورو ٹو،کنکورڈیا۔کنکورڈیا سے گوروٹو،گوروون،اردوکس،کھابر سے،للّی گو،پائیو،بردومل،جولا،کورفون اور اسکولے۔‘‘ چھوٹے قد والے نے انگلیوں پر پڑاؤ گنے۔

’’یار،للّی گو کا پڑاؤ اب نہیں ہے۔وہ تو لینڈ سلائیڈنگ سے ختم ہو گیا ہے۔تمہیں نہیں معلوم کیا؟‘‘میں نے حیرت سے پوچھا۔میں نے یہ بات کئی لوگوں سے سنی تھی اور کتابوں میں سے تصدیق بھی کی تھی۔

’’سٹیج ہے،ادھر کیمپ لگاتا ہے۔وہ ٹھیک ہے۔ہم نے دیکھا ہے سر۔‘‘اب پتا نہیں کہ کسی نے وہ جگہ صاف کر دی ہو لیکن میری معلومات کے مطابق ایک شدید لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے للّی گو کا مشہور میدان کیمپنگ کے لئے بالکل ناقابل استعمال تھا۔

’’سر دیکھو،ہم آپ کا کیمپ لگائے گا۔اگر کہے گا تو کھانا پکائے گا اور خدمت کرے گا۔راستہ مشکل ہے ہم آپ کا گائیڈ بھی بنے گا۔‘‘پورٹر نے ہمیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

’’اچھا چلو کیمپ لگانا تو مشکل نہیں،لیکن اگر ککنگ کرو گے تو اس کے کتنے پیسے لو گے؟‘‘میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

’’کک کا ریٹ پورٹر سے زیادہ ہے۔ہمیں دونوں کا پیسہ دو تو ہم ککنگ کرے گا۔اگر پورٹر کا سرداری کرنا ہے تو اس کا پیسہ بھی دے دو ہم سرداری بھی کرے گا۔‘‘

ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''اطہر صاحب، ابھی تو اور بھی بہت کچھ ہوگا۔ ذرا مزید کریدیں۔'' عظیم نے مسکراتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

''اچھا یار، اور تمہاری کوئی شرط تو نہیں؟''

''سر، ہم آپ کا خدمت کرے گا۔ گورنمنٹ ریٹ تو کم ہے۔ آپ کو ایسا علاقہ دکھائے گا کہ آپ کا دل خوش ہوگا۔ ہمارا یونی فارم اور بوٹ دو۔ راشن کا پیسہ دو تو ہم اپنا راشن لائے گا۔ ادھر اسکولے سے بکرا لے گا پائیو کے لئے۔ آپ کا خدمت کرے گا اور خوش ہوگا تو اپنی خوشی سے جو دل کرے گا دے گا۔''

یہ پورٹر تو ہواؤں میں کے ٹو سے بھی اوپر اڑ رہا تھا۔

ابھی معلوم نہیں کیا کیا انکشافات باقی تھے۔ لیکن ہمارے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ اتنے مہنگے پورٹر لینے کے بعد شاید ہمیں سکردو میں اپنا سارا سامان بھی بیچنا پڑ جاتا۔

سکردو روانگی سے قبل میں نے راستے، پورٹروں اور روایتی طریقہ کار کے متعلق خاصی چھان بین کی تھی۔ میرے علاوہ عظیم بھی ٹریکنگ کے معاملات کا خاصا تجربہ رکھتا تھا۔

بلتی پورٹروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بہت جفاکش اور تجربہ کار ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان سے معاملات طے کرنا بھی خاصا مشکل کام ہے۔ سکردو کی اس سرائے میں ملنے والے یہ پورٹر ہمیں بہت مہنگے اور کم تجربہ کار لگے۔ دوران گفتگو مجھے احساس ہوا کہ یہ پورٹر کنکورڈیا تک گئے تو ہیں لیکن کم از کم اس سال نہیں۔

معاوضے کے معاملے میں بھی یہ ہم سے ضرورت سے کہیں زیادہ توقعات لگائے بیٹھے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز تو غریب لوگ ہوتے ہیں۔ یہ تو موٹی آسامیاں ہیں اور کہیں سے کوئی بینک لوٹ کر آئے ہیں۔

اگر ہم اس پورٹر کی توقع کے مطابق چلتے تو ہمیں اسے بیس ہزار سے زائد کی ادائیگی کرنی پڑتی۔ ایک پورٹر کی ایک کک کی اور ایک سردار کی۔ عام طور پر گورنمنٹ کے مخصوص کردہ اصولوں کے مطابق ایک پورٹر کا معاوضہ زیادہ سے زیادہ چھ ہزار روپے بنتا تھا۔ اب پتہ نہیں کہ ہم شکل سے اتنے بے وقوف نظر آتے تھے یا وہ پورٹر کسی خوش فہمی میں مبتلا تھا۔

خیر، پورٹروں کے بغیر ہم کسی صورت اپنی مہم پر نہیں نکل سکتے تھے اس لئے کوئی معاملہ طے کرنا بھی ضروری تھا۔ ہم گورنمنٹ ریٹ، منظور شدہ خوراک اور سہولیات پر اصرار کرتے۔ وہ راستے کی مشکلات اور پورٹروں کی کمی کو بڑھا

چڑھا کر بیان کرتے اور کئی قسم کی اضافی مراعات کا تقاضہ کرتے اور پھر احتجاج کے طور پر واک آؤٹ کر جاتے۔

باہر جا کر آپس میں ہاتھ ہلا ہلا کر آپس میں بحث کرتے اور پھر اندر آ کر ہمیں اپنی شرائط پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنے لگتے۔

کئی مرتبہ ایسا ہی ہوا۔

ہم بضد تھے کہ وزارت سیاحت کے منظور شدہ فی پڑاؤ معاوضے، خوراک اور لباس وغیرہ پر ہی معاملہ طے ہو۔ لیکن ان کا تقاضہ تھا کہ خوراک، معاوضے اور دیگر لوازمات کے ساتھ ساتھ اضافی رقم بھی دی جائے جو کہ بہر صورت نامناسب تقاضا تھا۔

آس پاس بیٹھے چائے پینے یا کھانا کھانے والوں کے لئے یہ صورتحال ایک دلچسپ تماشا بن چکی تھی۔ سب لوگ اپنی باتیں اور کام چھوڑ چھاڑ کر اب ہماری طرف دیکھ رہے تھے اور لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ صورتحال ہمارے لئے شرمندگی کا باعث بن رہی تھی اور ہم اپنے آپ کو اچھا خاصا بے بس محسوس کرنے لگے تھے۔

دوپہر ہوگئی پر ہم کسی نتیجے پر نا پہنچ سکے۔ عجیب مخمصے میں پھنس کر رہ گئے تھے ہم۔ میں اور عظیم اٹھ کر باہر آ گئے۔

''میرا خیال ہے کہ ان کے ساتھ شاید ہماری بات نا بن سکے۔'' میں نے عظیم سے کہا۔ ''کب سے ہم انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن مجال ہے کہ یہ اپنے مطالبات سے ٹس سے مس بھی ہوئے ہوں۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ ہم صرف اور صرف وقت ضائع کر رہے ہیں۔ یہ پورٹر ہمارے لئے مناسب نہیں۔ دیکھیں ناسکردو میں ان کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے وہاں بالتورو پر جا کر انہوں نے ہڑتال کر دی تو ہم کیا کر لیں گے؟'' عظیم نے ایک اہم خدشے کی طرف توجہ دلائی۔

عظیم کا کہنا بھی قرین قیاس تھا کہ ٹریک پر جہاں ہم بہت حد تک ان پر انحصار کر رہے ہوں گے ان کی کوئی بھی نامناسب فرمائش یا غیر ذمہ دارانہ رویہ بہت تکلیف دہ ہوسکتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ان سے معذرت کر کے کوئی اور پورٹر تلاش کئے جائیں۔

''اطہر صاحب، میں اب جا کر فوراً کسی قریبی ہوٹل میں مناسب کمرے دیکھتا ہوں، آپ ان پورٹروں کو واپس بھجوائیں۔ ہمیں کچھ دیر کسی پرسکون ماحول کی ضرورت ہے جہاں ہم غور کر کے کسی آسان حل تک پہنچ سکیں۔ مجھے تو اس ماحول میں بہت شرمندگی محسوس ہونے لگی ہے۔'' عظیم سر ہلاتا ہوا بازار کی بھیڑ میں گم ہوگیا۔

واپس اپنی جگہ بیٹھ کر میں نے پورٹروں سے معذرت کی اور یاسر اور زاہد کے ساتھ پھر اٹھ کر باہر آ گیا۔ ہوٹل میں ان پورٹروں کے ٹلنے کے امکانات نظر نا آتے تھے اس لئے باہر نکل آنا ہی بہتر تھا۔

زاہد اور یاسر شدید غصے میں تھے۔ وہ ان پورٹروں کے ماضی اور حال کے بارے میں نجانے کس علم کو بروئے کار لاتے ہوئے طرح طرح کے خیالات کا اظہار کرنے لگے تھے۔

اتنے میں عظیم بھی خوش خوش آتا نظر آیا۔

''چلیں جی، ایک مناسب اور آرام دہ کمرے کا بندوبست ہو گیا ہے۔ ادھر ایک دو گلیاں چھوڑ کر وہ ہوٹل ہے اور میں پہلے بھی وہاں ٹھہر چکا ہوں۔ وہاں کا کھانا بھی اچھا ہے اور کمرے بھی صاف ستھرے ہیں۔'' عظیم نے خوشخبری سنائی۔

''چلو یار، سامان چکو۔ اینا پورٹراں نے تے ۔۔۔۔۔'' زاہد پھر شروع ہونے لگا تھا اس لئے میں فوراً سامان اٹھانے کی نیت سے چل پڑا۔

مل جل کر سامان اٹھایا گیا اور ہم جلد ہی لب سڑک واقع ایک صاف ستھرے ہوٹل کی پہلی منزل پر واقع ایک چار بستروں والے بڑے کمرے میں منتقل ہو گئے۔ عظیم کی بات درست تھی۔ کمروں میں صفائی اور مسافروں کے آرام کا خاصا خیال رکھا گیا تھا۔ آرام دہ بستر پر دراز ہوا تو احساس ہوا کہ کمر کو نجانے کب سے اس نعمت کی تلاش تھی۔

گونڈوگورو سے کنکورڈیا جاؤ

ہوٹل کے کمرے میں منتقل ہونے کے دو گھنٹے بعد ایک ہنگامی نوعیت کی میٹنگ جاری تھی۔

ہم چاروں کے علاوہ تین عدد افراد بھی اپنی قیمتی آراء اور مشوروں سے گفتگو کی گرما گرمی میں اضافہ کر رہے تھے۔

ہمارے پلان میں ایک بڑی تبدیلی متوقع تھی اور اس تبدیلی کے حق اور مخالفت میں دلائل، سوالات اور جوابات کا ایک سلسلہ جاری تھا۔

ان دو گھنٹوں میں نہانے دھونے اور کچھ آرام کرنے کے علاوہ ہم نے جو کچھ کیا وہ ہمارے لئے نئے امکانات اور طے شدہ منصوبے میں متوقع تبدیلی کا سبب ثابت ہوا۔

چند قابل اعتماد ذرائع سے اس بات کی تصدیق ہو چکی تھی کہ وادی شگر میں داسو کے مقام پر جیپ کا راستہ بند ہے۔ اگر ہم اسکولے کے راستے کنکورڈیا کا سفر اختیار کرتے ہیں تو داسو سے آگے کم از کم دو دن کا مزید پیدل سفر کرنا ہوگا۔

عام حالات میں پروگرام کے مطابق ہم نے سکردو سے اسکولے تک جیپ کا ناہموار سفر کرنا تھا اور اس کے بعد سارا پیدل سفر تھا۔

اسکولے وادی شگر کا آخری گاؤں ہے۔ وادی شگر سکردو سے چند کلومیٹر کے فاصلے سے شروع ہوتی ہے اور اس کا اختتام آٹھ ہزار میٹر بلند چوٹیوں پر ہوتا ہے۔ کے ٹو، براڈ پیک، گشابروم، ٹرانگو ٹاورز اور بالتورو ٹریک کے حوالے سے یہ وادی تمام دنیا میں مشہور ہے۔ شگر گاؤں اس وادی کے آغاز میں واقع ہے جہاں تک پختہ سڑک موجود ہے۔ شگر گاؤں سے آگے کا تمام راستہ کچا ہے اور کہیں بھربھری مٹی اور کہیں چھوٹے بڑے پتھروں پر مشتمل ہے۔

داسو، اسکولے سے پہلے ایک پس ماندہ علاقہ ہے۔ قراقرم کے سنگلاخ پہاڑوں میں لینڈ سلائیڈنگ کے باعث جیپوں کا کچا راستہ ان دنوں بند تھا اور تمام مہمات داسو سے اپنے پیدل سفر کا آغاز کر رہی تھیں۔

اس لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے اکثر سیاح سامان کی کثرت کے باعث سکردو سے زیادہ تعداد میں پورٹر ساتھ لے کر جا رہے تھے۔ یہی وجہ تھی جس نے سکردو میں پورٹروں کی قلت پیدا کی تھی اور پورٹروں کی تلاش اور ان سے معاملات طے کرنا ایک مہنگا اور مشکل کام بن چکا تھا۔

ابھی تک کی رکاوٹوں نے ہم میں سے کسی کو بھی بددل نہیں کیا تھا اور سب اپنے ارادوں پر قائم تھے۔ لیکن وقت کی کمی ہمارے لئے بہت بڑا مسئلہ تھا۔ ہمیں اپنے دفتری، گھریلو اور دیگر نجی مصروفیات کے لئے وقت پر واپس بھی پہنچنا تھا۔ اور موجودہ حالات میں وادی شگر سے گزرنے کی صورت میں ہمیں کئی دن کی تاخیر سے گھر پہنچنا تھا۔

راستے اور پورٹروں سے متعلق مصدقہ معلومات ہمیں سکردو میں نثار اور شاہد صاحب سے ملیں۔

اور یہ نثار اور شاہد صاحب ہمیں کیسے ملے؟

یہ یاسر کی یادداشت کا کارنامہ تھا۔ اپنی پیش قدمی میں حائل رکاوٹوں کے حل پر غور کے دوران اچانک یاسر کو یاد آیا کہ اس کی دکان پر سکردو کا ایک نوجوان نثار خریداری کے لئے اکثر آیا کرتا تھا۔ یاسر کا راولپنڈی کے ہول سیل بازار میں الیکٹرانکس کمپونٹس اور پارٹس وغیرہ کا کاروبار ہے جہاں دور دور سے لوگ خریداری کے لئے آیا کرتے ہیں۔

نثار بھی ایک دن کسی چیز کی تلاش میں یاسر کی دوکان پر آیا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ وہ سکردو سے آیا ہے۔ پہاڑوں سے دلچسپی اور سکردو کی سیاحت کی وجہ سے یاسر نے بھی نثار کو اپنے شوق کے بارے میں بتایا۔ خیر یاسر نے ہر ممکن طریقے سے نثار کو اس کی مطلوبہ اشیاء کی خریداری میں مدد دی۔ جواباً اپنا پتہ وغیرہ دینے کے ساتھ ساتھ نثار نے سکردو آنے کی صورت میں ہر ممکن تعاون کی پیش کش کی۔

اب وہ سب یاد آنے پر یاسر نے نثار کا پتہ تلاش کرنا شروع کیا۔ پہلے اس نے اپنے بیگ کی تلاشی لی، پھر بٹوہ کھولا، دوبارہ بیگ کی جیبوں کو کھنگالا اور بالآخر کسی گوشے سے ایک بوسیدہ کاغذ برآمد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہم سب کو فاتحانہ نظروں سے دیکھنے کے بعد اس نے بآواز بلند پتہ پڑھا۔ پتہ سکردو کا ہی تھا اور ہوٹل کے ایک ویٹر سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ خاصا نزدیک ہے۔

ویٹر نے جو راستہ بتایا وہ تقریباً اسی جگہ کا تھا جہاں ہم صبح ٹریکنگ کا سامان وغیرہ دیکھتے رہے تھے۔ ایک امید دیکھتے ہوئے میں اور یاسر اٹھے اور نثار کی تلاش میں نکلے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ہم نثار کی دکان پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

یاسر کو دیکھ کر نثار بہت حیران اور خوش ہوا۔ ابھی وہ نہایت گرمجوشی سے کھانے پلانے کے چکروں میں پڑنے ہی لگا تھا کہ میں نے بمشکل سے اسے روکتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ اس نے ہماری بات توجہ سے سننے کے بعد پرانی تمام اطلاعات کی تصدیق کی۔

''جی بھائی، آپ نے ٹھیک سنا ہے۔ یہاں بازار میں شگر، ہوشے اور ارد گرد کے ہر علاقے سے لوگ آتے ہیں۔ اسکولے کا لوگ بھی آتا ہے اور ہمیں پتا ہے کہ راستہ بند ہے۔'' نثار نے وثوق سے کہا۔

''نثار بھائی، تو آپ کے خیال میں مناسب وقت اور کم ترین مشکلات کے ساتھ کیا حل ڈھونڈا جا سکتا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

نثار نے کچھ سوچا اور بولا'' پہلے میں بھی پورٹری اور گائیڈ کا کام کرتا تھا لیکن اب وہ کام میں نے چھوڑ دیا ہے۔ میں کئی دفعہ کنکورڈیا اور کے ٹو بیس کیمپ گیا۔ ابھی بہتر ہے کہ آپ کو اپنے ایک عزیز کے پاس لے جائے۔ ان کا اپنا ٹریکنگ اینڈ ایکس پی ڈیشن کمپنی ہے۔ وہ آپ کو صحیح بات بتائے گا۔''

ہم اس وقت خود کسی ایسے ہی شخص کی تلاش میں تھے جو ہمیں کم از کم وقت میں کنکورڈیا تک پہنچنے کی کوئی صورت بتا سکے۔

''لیکن آپ کی دوکان کا کیا ہوگا۔ آپ ہمیں پتہ سمجھا دو ہم خود ہی چلے جاتے ہیں۔'' یاسر نے نثار کے کام کا حرج دیکھتے ہوئے کہا۔

''یاسر بھائی، ایک تو آپ لوگ کوئی خدمت نہیں کرنے دے رہا۔ اب اتنا شرمندہ تو نا کرو۔ یہ کیسا ہو سکتا ہے کہ آپ ادھر آیا اور ہم آپ کا ساتھ نا جائے۔'' نثار کے لہجے میں خلوص ہی خلوص تھا۔

ایک ٹیکسی پکڑ کر ہم نثار کے ساتھ روانہ ہوئے۔

کوئی دس منٹ کے سفر کے بعد سکردو کے مین بازار اور ملٹری ہسپتال وغیرہ سے گزرتے ہوئے ہم ایک کشادہ احاطے میں بنے پرسکون سے دفتر میں داخل ہوئے۔ ہوشے ٹریکس اینڈ ٹورز کا بورڈ یہ بتانے کے لئے کافی تھا کہ ہم صحیح جگہ آئے ہیں۔ نثار نے ایک کمرے میں داخل ہو کر کسی سے بلتی زبان میں کچھ کہا اور ہمیں ایک سلیقے سے آراستہ کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ہم خوبصورت شخصیت اور خوشگوار طبیعت کے مالک شاہد صاحب سے گفتگو کر رہے تھے۔

''دیکھیں بھائی، اب ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ اپنے پلان میں تبدیلی کریں۔ شِگر کے راستے کنکورڈیا پہنچنے کے لئے کم ازکم ایک ہفتہ لگ جاتا ہے اور واپسی تک کے لئے ظاہر ہے دو ہفتے۔ مناسب یہ ہے کہ اگر آپ لوگ چیلنج قبول کرنے کی پوزیشن میں ہیں تو ہوشے سے گونڈوگورولا کے راستے کنکورڈیا جائیں۔'' شاہد صاحب نے ہماری کتھا سننے کے بعد رائے دی۔

''شاہد صاحب، لیکن میں نے تو سنا ہے کہ گونڈوگورو پاس اچھا خاص بلند ہے اور راستہ بھی بہت دشوار ہے!'' میں نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

''جی یہ بات تو ہے۔ راستہ مشکل ہے۔ ہوشے سے لے کر گونڈوگورو تک مسلسل چڑھائی کا ہی راستہ ہے۔ لیکن کوشش کر کے تین دن میں ہوشے سے کنکورڈیا پہنچا جاسکتا ہے۔ آپ کو وقت کا مسئلہ ہے اور کم وقت میں کنکورڈیا کا اس سے بہتر راستہ کوئی بھی نہیں۔'' شاہد صاحب نے کہا۔

''ویسے میں نے کبھی اس راستے کے بارے میں نہیں سنا'' یاسر کے لئے یہ ایک نئی بات تھی۔

"عام طور پر یہ راستہ عموماً زیادہ لوگوں کو نہیں بتایا جاتا کیونکہ سب لوگ اتنے مشکل راستے کو عبور نہیں کر پاتے۔ گونڈوگورو پاس کی چڑھائی اس طرف سے بہت شدید ہے۔" شاہد صاحب نے کہا۔ "اور اگر آپ اسکولے سے ہی جانا چاہتے ہیں تو بھی میں تمام بندوبست کروادوں گا۔ اب آپ اپنی باقی ٹیم سے بھی مشورہ کرلیں۔ مزید معلومات یا تعاون کی ضرورت ہو تو آپ کہیں سے بھی فون کر کے ہر طرح کا مشورہ کر سکتے ہیں۔"

ہوشے اور گونڈوگورولا کا آئیڈیا مجھے اچھا لگا۔ کیونکہ ہوشے میں ہمارے بھی بعض پرانے جاننے والے موجود تھے جن کے ساتھ ہم کچھ ٹریکس کر چکے تھے، دوسرا وہاں کے لوگ زیادہ خوش اخلاق اور تعاون کرنے والے ہیں۔ لیکن جن مشکلات کا ذکر شاہد صاحب نے کیا تھا اس پر بھی غور کرنا ضروری تھا۔ اس لئے بہتر یہی تھا کہ پہلے آپس میں اس رائے کے بارے میں بات کرلی جائے۔ شاہد صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ہم باہر آ گئے۔

زاہد اور عظیم خاصی بے چینی سے ہمارے منتظر تھے۔ ہوٹل آ کر سب کے سامنے شاہد صاحب سے ہونے والی گفتگو من وعن بیان کر دی۔

''لیکن اطہر صاحب، ایک دم پروگرام میں اتنی بڑی چینج!'' عظیم کچھ پریشان سا ہو گیا۔

''دیکھ لیں جی، سب آپ کے سامنے ہے۔ ہمیں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہے کہ اب کیا مناسب ہوگا۔'' میں نے

جواب دیا۔

''ویسے یار، ہوشے کے لوگ تعاون کرتے ہیں۔ اور پورٹر بھی اس طرح نخرے نہیں کریں گے!'' یاسر نے پرانے تجربے کی بنیاد پر کہا۔

''بھائی، فیصلہ آپ خود کرو۔ لیکن یہ دیکھو کہ ادھر آپ کا وقت بچے گا اور ہوشے تک جیپ پر جاؤ۔ ادھر پڑاؤ بھی چھوٹا ہے اور آپ دو پڑاؤ ایک دن میں چل سکتا ہے۔' گونڈوگورولا سے آگے سب اترائی ہے، ایک دفعہ اوپر جاؤ تو آگے کوئی مشکل نہیں ہوتا'' نثار جو خاموشی سے ہماری بات چیت سن رہا تھا اچانک بول پڑا۔

مجھے ایک دفعہ پہلے علی حسن نے بھی اس راستے سے کنکورڈیا جانے کا بتایا تھا۔ علی حسن ہوشے سے تعلق رکھنے والا ایک ہردم معاون شخص ہے جو چند برس پیشتر ہمیں سکردو سے خپلو جاتے ہوئے ملا تھا۔ اب ہوشے کا نام آیا تو علی حسن کا نام فوراً میرے ذہن میں آیا۔

''یاسر، یار اگر علی حسن مل جائے تو ہوشے میں ہمارے بہت کام آئے گا!''

''اوہ ہاں علی حسن! لیکن وہ ہوگا کہاں۔ شاید ہوشے میں مل جائے!'' یاسر کو بھی ایک دم یاد آ گیا۔

''آ ہو شاہ جی، بڑا اچھا بندہ ہے علی حسن۔ مشہ بروم کے لئے بڑی مدد کی یار اس نے۔ پتہ کرو یار اس کا'' زاہد نے بھی فوراً اس سے رابطے کی خواہش ظاہر کی۔

''کون سا علی حسن؟ مچلو والا؟'' نثار نے پوچھا۔

''نثار بھائی، وہ تو ہوشے گاؤں میں رہتا ہے، مچلو میں تو نہیں!'' یاسر حیران ہوا۔

''ٹھیک ہے۔ ادھر کا علی حسن بھی ہے۔ میں سمجھ گیا۔ بہت دن سے اسے دیکھا نہیں اس لئے یاد نہیں تھا۔'' نثار نے سر ہلایا۔

''نثار بھائی، یار کوئی طریقہ ہے علی حسن کو ڈھونڈنے کا؟ آدمی بڑے کام کا ہے۔'' زاہد نے نثار کی طرف دیکھا۔

''ادھر۔۔۔ کس کو معلوم ہوگا۔۔۔ ادھر گاؤں کا آدمی ہے، میں ان سے معلومات لیتا ہے۔'' کچھ سوچ کر نثار جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

بلتستان کے تمام چھوٹے بڑے علاقوں کے لوگ روزگار، خریداری، ہسپتال اور آمدورفت کے لئے سکردو کو ہی مرکز سمجھتے ہیں۔ اس لئے یہاں ہر علاقے کے لوگ کسی نا کسی کام کے سلسلے میں عارضی یا مستقل طور پر رہائش پذیر رہتے

ہیں۔اب نثار ہوشے کے کسی باشندے کی تلاش میں نکلا تو ہمیں امید ہوئی کے شاید علی حسن کا کوئی اتا پتہ مل ہی جائے۔علی حسن سے ملاقات کی صورت میں ہمارے بے شمار مسائل حل ہونے کی توقع تھی۔اس لئے ہم نثار کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد نثار واپس آیا تو اس کے ساتھ دو محنت کش قسم کے بلتی حضرات بھی تھے۔معلوم ہوا کے یہ حضرات بھی ہوشے سے تعلق رکھتے ہیں اور علی حسن کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

اس موقع پر ایک ہنگامی اجلاس کی صورت خود بخود پیدا ہوگئی اور ہم سب ہوشے، گونڈوگورولا، راستے اور پڑاؤ وغیرہ کے بارے میں تابڑتوڑ سوالات کے ذریعے اپنے نئے پلان کے تانے بانے بننے لگے۔

ہوشے سے تعلق رکھنے والے ان حضرات نے بتایا کہ علی آج کل ایک کینٹین چلا رہا ہے۔کہاں چلا رہا ہے؟ اس کے جواب میں جس جگہ کا وہ نام لیتے، بار بار کہلوانے کے باوجود اس کا نام ہماری سمجھ میں نہ آتا۔

کبھی 'خپنگ'، کبھی 'سپاں'، کبھی 'حسپاں'۔۔۔

بلتی زبان میں بعض الفاظ کی ادائیگی ایسی ہے جو ہم جیسوں کو سمجھ نہیں آتی۔بالآخر ایک ٹریکنگ گائیڈ میں ڈھونڈنے سے معلوم ہوا کے یہ اصل میں 'ہسپنگ' ہے۔وادی ہوشے کے دشوار ترین حصے کی آخری کیمپ سائیٹ جس سے آگے گونڈوگورو پاس ہے۔ہوشے سے ہسپنگ تک چار پڑاؤ ہیں جو ہمت کر کے دو دن میں طے کئے جا سکتے ہیں۔

پورٹروں کے متعلق پتہ چلا کہ ہوشے میں یہ بندوبست بھی آسان ہے اور سکردو کی طرح ہوشے کے پورٹر غیر معمولی اجرتوں کا مطالبہ بھی نہیں کرتے۔آج کے تجربے کے بعد ہم پورٹروں کے معاملے کو انتہائی سنجیدگی سے لینے لگے تھے۔اور اب ہمارے پاس کسی بھی طور پر اتنا وقت نہیں تھا کہ پورٹروں سے ہی معاملات طے کرتے رہ جائیں اور چھٹیاں پوری کر کے گھر لوٹ جائیں۔

ایک طویل بحث کے بعد ہم اسی نتیجے پر پہنچے کہ ہوشے کے راستے کنکورڈیا ہی ہمارے لئے مناسب ترین انتخاب باقی بچا ہے۔اس لئے اسکولے کے بجائے فوری طور پر ہوشے پہنچ کر اپنے سفر کا آغاز کر دیا جائے۔مشکل راستے کے بارے میں سوچا گیا کہ کنکورڈیا جانا ہے تو آسان راستہ کوئی بھی نہیں ہوسکتا۔اب دیکھا جائے گا کہ گونڈوگورو پاس سے یہ کتنا مشکل ہے۔

اس نتیجے تک پہنچتے پہنچتے شام ہو چکی تھی اور اس وقت خپلو کی گاڑی ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔لہٰذا اب اگلی صبح ہمیں

ہر حال میں پہلے خپلو اور پھر شام تک ہوشے پہنچنا تھا۔یعنی ابھی خپلو تک پہنچنا ہماری پہلی ترجیح تھی۔خپلو کی روانگی سے متعلق معاملات یاسر کے ذمہ لگائے گئے جو نثار کے تعاون سے انجام پانے تھے۔

یاسر، نثار اور ہوشے والے حضرات اٹھے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔زاہد کافی دیر سے آرام کر رہا تھا لیکن اب بھی تھکا ہوا تھا۔ایک لمبی انگڑائی لینے کے بعد وہ پھر بستر پر دراز ہوگیا۔

''عظیم، میں نے کہا رات کا کھانا تو ادھر ٹھیک مل جائے گا نا؟ کمرہ اچھا ہی مل گیا ویسے۔''

سکردو، شہرِ بے مثال

اب چونکہ ہم ایک نتیجے پر پہنچ چکے تھے اور انتظامات بھی تقریباً مکمل تھے اس لئے میں اٹھا اور ہوٹل سے باہر آ گیا۔ سکردو کی ایک خوشگوار شام میں کسی بند جگہ میں بیٹھ کر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

باہر نکل کر میں نے بلا مقصد اور بے سمت آوارہ گردی شروع کی۔

دنیا کے اس مشہور ترین پہاڑی شہر کو سمجھنے کا یہ طریقہ سب سے بہتر لگا۔ پہلے سکردو کے بازار کی سیر کرتا رہا اور بلتستان کے اس کاروباری مرکز کا جائزہ لیا۔

سادہ لیکن بارونق بازاروں میں ہر طرح کی اشیاء موجود تھیں۔ کہیں روزمرہ استعمال کی اشیاء سے بھری دوکانیں تھیں اور کہیں سیاحوں کی دلچسپی کا سامان سجا رکھا تھا۔ قیمتی پتھر، زیورات، ہینڈی کرافٹس، انٹیکس، پوسٹر اور خشک میوہ جات کی دوکانیں جا بجا نظر آ رہی تھیں۔ میں نے سرسری طور پر چند دوکانوں کا جائزہ بھی لیا۔ گھریلو سطح پر مقامی لوگوں کے تیار کردہ کڑھائی وغیرہ کا کام خاصا خوبصورت تھا۔ ہر طرح کے قیمتی پتھر بھی شیشے کے شوکیسوں میں سجے اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ لیکن ان پتھروں کے حقیقی ہونے کی پہچان ہونا ضروری ہے۔ ایک انٹیک شاپ میں گیا۔ پیتل، تانبے اور چاندی وغیرہ کے برتن اور پتھر اور لکڑی کی قدیم اشیاء دیکھیں، قیمت پوچھی اور فوراً باہر آ گیا۔ چھوٹی بڑی تمام اشیاء میرے وارے سے باہر تھیں۔

باہر مقامی خریدار، طلباء اور غیر ملکی سیاح جن میں اکثریت یورپی ممالک سے آئے ہوئے لوگوں کی تھی، ہر طرف گھومتے نظر آ رہے تھے۔ ان غیر ملکی سیاحوں کے چہروں پر مختلف تاثرات نظر آتے تھے۔ وہ سیاح جو ابھی ہماری طرح آگے بلندیوں پر کسی ان دیکھے، ان جانے اور حواس پر چھا جانے والے مناظر کی طرف جانے کی تیاری کر رہے تھے، ان کے چہروں پر ولولے، ہیجان اور کسی قدر تفکرات کی ملی جلی پرچھائیاں تھیں۔ آگے کیا ہوگا؟ راستہ کیسا

ہے؟ وہ مناظر جو ہم تصاویر میں دیکھ کر بے چین ہو گئے تھے کیا اتنے ہی حسین ہوں گے یا وہ کسی فوٹو گرافر کی جادوگری تھی؟ مشکلات اور خطرات کا سامنا کتنا ہے؟ اور پھر کبھی اس بازار کی یہ رونق دیکھنے والوں میں ہم بھی ہوں گے؟

اور وہ سیاح جو بلندیوں سے اپنی کامیاب مہمات کے بعد اس شہرِ بے مثال میں شاید اپنی آخری شام گزار رہے تھے کے چہروں پر ثبت حیرانگی اور بے یقینی، اللہ کی بنائی ہوئی کائنات کے منفرد ترین نظاروں کا حسن، پتھریلے اور برفانی راستوں کی تھکاوٹ اور موسموں کے اتار چڑھاؤ کے مقابلے میں سنولائی اور جلی ہوئی رنگت واضح نظر آتی تھی۔ ان سیاحوں میں وہ کوہ پیما بھی ہوں گے جو خیالوں سے بلند کسی ہیبت ناک برفانی چوٹی کو سر کر کے لوٹے ہیں اور ایسے ٹریکر بھی جو قدرت کو اس کے حقیقی رنگ میں دیکھنے کی خواہش کو پورا کر کے آ رہے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ واپس جانے والے ان غیر ملکیوں کو قراقرم کے یہ تجربات اور یادیں اپنی زندگی کی تمام کامیابیوں سے زیادہ عزیز رہیں گی اور اپنے ہم وطنوں، عزیزوں اور بچوں کو اپنی تصاویر دکھا کر وہ ہمیشہ کہا کریں گے

''یہ دیکھو، سونے کی طرح چمکتے اس پہاڑ کے نیچے یہ میں کھڑا ہوں۔ تمہیں پتا ہے غروب ہوتے سورج کے ناقابل یقین مناظر والی یہ جنت کہاں ہے؟ پاکستان کے شہر سکردو کی ایک وادی میں! اور بہت سال پہلے میں وہاں تھا۔''

سکردو کی بڑی سڑک پر اس وقت کافی ٹریفک تھی لیکن بڑے شہروں کی طرح بے ہنگم اور بے قابو نہیں تھی۔ پہاڑی علاقے کی مناسبت سے یہاں زیادہ تر سفر جیپوں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ لمبی، چھوٹی، نئی، پرانی ہر طرح کی جیپیں سڑک پر دوڑتی پھرتی ہیں۔ اکثر یہ جیپیں سواری اور مال گزاری دونوں کام بیک وقت کرتی ہیں۔ یعنی سیٹوں کے نیچے ہر طرح کا سامان اور اوپر مسافر۔ آس پاس کے تمام دیہاتوں اور وادیوں کے لئے یہی جیپیں پبلک ٹرانسپورٹ کا کام دیتی ہیں۔

ایک دو دفعہ ہمیں بھی ان جیپوں میں سفر کا تجربہ رہا ہے۔ گھی کے کنستروں، آٹے دال کی بوریوں اور مرغیوں کے ٹوکروں وغیرہ کے اوپر جہاں جگہ ہو وہاں مسافر بٹھا دیے جاتے ہیں۔ اگر آپ کو بھی کبھی یہ تجربہ ہو اور آپ کی نشست کے نیچے زور سے ''کڑکڑ کڑاں'' کی آواز آئے تو گھبرانے کی بات نہیں۔ کسی ٹوکرے میں قید کسی مرغی کا دم گھٹ رہا ہوگا!

بازار کی بھیڑ بھاڑ سے نکل کر میں پرسکون علاقے کی طرف آیا۔ ڈھلتی شام کا یہ وقت بازار کی رونق دیکھنے کا نہیں، قدرت کی ضوفشانیوں سے لطف اندوز ہونے کا تھا۔ اور قدرت کے یہ انمول رنگ دیکھنے کے لئے سکردو میں زیادہ

جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔

سکردو بہت سے قدرتی عجائب کا ایک مجموعہ ہے۔

سطح سمندر سے اس کی بلندی پچیس سو میٹر ہے۔ یہاں سیاحت کا موسم اپریل کے اخیر میں شروع ہوتا ہے جو ستمبر یا زیادہ سے زیادہ اکتوبر تک رہتا ہے۔ باقی مہینوں میں یہ بلند شہر شدید سردی اور برف کی وجہ سے عام لوگوں کے لئے ناقابل رسائی ہے۔ سردی کا اندازہ اس بات سے لگائیں کے شدید گرمی میں جب ہمارے میدانی علاقے چالیس درجے سینٹی گریڈ سے بھی زیادہ گرم ہو جاتے ہیں یہاں کا درجہ حرارت پچیس درجے سے اوپر نہیں جاتا۔ صبح اور رات کے وقت درجہ حرارت تیزی سے گرتا ہے اور سات آٹھ ڈگری پر آ جاتا ہے۔ اس وقت یہاں گرم کپڑے پہننے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ سردیوں کا درجہ حرارت منفی دس ڈگری سے بھی کم رہتا ہے۔ دل کرے تو کبھی چکر لگا کر دیکھئے!

یہاں کسی بھی مقام سے دیکھیں تو نظریں چاروں طرف بلند پتھریلے پہاڑوں سے ٹکراتی ہیں۔ ان میں سے بعض پہاڑوں کی چوٹیوں اور ڈھلوانوں میں تمام سال برف نظر آتی رہتی ہے۔ ان بلند پہاڑوں کی دیوار آٹھ ہزار میٹر کی چوٹیوں کے درمیان حائل ہے۔ دیوسائی کی بلندیاں بھی سکردو کی پہچان کی خاص وجہ ہیں۔ دنیا کا یہ بلند ترین میدان اپنی انفرادی خصوصیات کی وجہ سے ایک عجوبہ ہے۔ سکردو سے ست پارہ جھیل کے راستے دیوسائی تک جیپ کے ذریعے جانا بھی کافی دل گردے کا کام ہے۔ دیوسائی کی بلندی چار ہزار میٹر سے زیادہ ہے۔ سکردو سے دیوسائی کا سفر آسمان کا سفر ہے۔ عمودی اور لامتناہی چڑھائی، پے در پے تنگ موڑوں پر مشتمل!

دریائے سندھ بھی سکردو میں عجب منظر پیش کرتا ہے۔ سفید رنگ کی ریت کے درمیان اور بے شمار نالیوں کی شکل میں بہتے دریا کا منظر کسی بھی دریائی اور پہاڑی منظر سے زیادہ دلچسپ، پرسکون اور منفرد ہے۔ ست پارہ اور کچورہ جیسی نیلگوں جھیلیں، آسمان کو چھوتی پتھریلی چٹانیں اور دریائے سندھ کو راستہ دیتا سفید ریگستان! اس سفید ریگستان کے پس منظر میں سفیدے اور پاپلر کے سدا بہار سرسبز درخت جو ہر وقت تیز ہواؤں میں لہراتے دور سے کسی فصل کی مانند نظر آتے ہیں۔

سورج سکردو میں جلدی اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے۔ بلند و بالا بھوری چٹانیں سورج کو اپنی پیچھے چھپا کر بہت دیر تک اپنی چوٹیوں کو اس کی کرنوں سے چمکاتی رہتی ہیں۔ اور اس وقت سکردو ایک ایسے رنگ میں ڈوب جاتا ہے جو بے مثال

ہے۔

خیالوں اور خوابوں سے بہت بلند بلتستان کا دل سکردو واقعی عجائبات کا ایک مجموعہ ہے۔

جب چوٹیوں کی جگمگاہٹ بھی دھیمی پڑ گئی اور ماحول کی خنکی بھی بڑھ گئی تو میں واپس ہوٹل کی طرف مڑ گیا۔

راستے بھر میرے ذہن میں ایک ہی خیال تھا کہ قدرت نے ہمیں دنیا کی حسین ترین نعمتیں عطا کی ہیں۔ اس کا اعتراف اگر کسی نے نہیں کیا تو وہ صرف ہم ہی ہیں۔ دنیا کی ہر زبان میں لکھے گئے ادب میں شمالی علاقہ جات کی رعنائیاں ملتی ہیں۔ بڑے سے بڑے ادیب اور شاعر نے ہمارے علاقوں کے تذکرے سے اپنی تخلیقات کو مزین کیا ہے۔ کتابوں کا انبار ہمارے ملک کی خوبصورتی کی داستانیں اپنے اندر سموئے ہوئے ہے لیکن ہم پر ان میں سے کسی چیز کا بھی اثر نہیں ہوتا۔ ہمارے ہم وطن یورپ اور امریکہ کے ساحلوں، شہروں، عمارتوں اور دیگر عجائبات سے تو شدید متاثر ہیں لیکن اپنے وطن کے قدرتی مناظر سے واقف تک نہیں!

تینوں ٹیم ممبران ہوٹل کے ڈائننگ روم میں ایک بڑی کھڑکی کے پاس میز کے اردگرد بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہاں سے نیچے بازار کی رونق اور پس منظر میں ست پارہ کے پیچھے دیوسائی تک کے پہاڑ ایک خوبصورت منظر پیش کر رہے تھے۔

''کیا اسکولے چلے گئے تھے؟'' یاسر نے میرے بیٹھنے کا بھی انتظار نا کیا۔

''زاہد کو نیند آ رہی تھی، میں نے سوچا سکردو میں وقت کا فائدہ ہی اٹھا لوں۔ ذرا آس پاس کا چکر لگانے گیا تھا۔''

''بہت اچھے! مجھے ٹکٹیں اکٹھی کرنے پر لگا دیا اور خود سیر سپاٹے ہو رہے ہیں۔ میرے پیسے واپس کرو بلکہ میرے کام کے پیسے بھی دو۔'' یاسر جل اٹھا۔

''میرا تو خیال ہے تمہیں سکردو میں ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ کیا کرو گے آگے جا کر۔ واپسی کا کرایہ ہے نا تمہارے پاس؟'' میں نے اسے مزید ستانے کی کوشش کی۔

''چلو ٹھیک ہے۔ ویسے بھی کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے تھے اور فضول بیٹھنے کی نسبت ہم نے دو تین دفعہ بوتلیں وغیرہ پی لی ہیں۔ بس تھوڑی دیر میں چکن کڑاہی اور دریائے سندھ کی تازہ مچھلی آنے والی ہے۔ وہ کھا لوں پھر واپسی کا سوچتا ہوں۔'' یاسر نے دانتوں کی نمائش کی اور میرا دل بیٹھنے لگا۔

زاہد کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بھی شرارت چمک رہی تھی۔ ''یار، وہ۔۔ سبزی بھی ڈھنگ کی کوئی نہیں

تھی۔۔اور۔۔دال تو آگے کھانی ہے سارے راستے۔ہم نے سوچا چلو آج کوئی ماس بوٹی ہی چکھ لیں۔''

میں سمجھ گیا کہ میری غیر موجودگی کو غنیمت جانتے ہوئے یاسر اور زاہد نے یہ پلان بنایا تھا۔راستے میں ہنگامی حالات کے باعث انہیں مانسہرہ کے سموسوں کا بدلا لینے کا موقع نہیں ملا تھا۔

''اطہر صاحب،کل صبح چھ بجے پہلی گاڑی میں جگہ مل گئی ہے۔ابھی کھانا وغیرہ کھا کر ہمیں آرام کرنا چاہئے۔''عظیم نے نقص امن کے خدشے کے پیش نظر موضوع بدلنا ہی مناسب سمجھا۔

''صبح چھ بجے! ویسے ٹھیک ہے ہمیں ہوشے پہنچنا ہے کل ہی۔اور صبح جلدی نکلنے سے ہم شام سے پہلے ہوشے پہنچ سکتے ہیں۔'' مجھے توقع نہیں تھی کہ صبح اتنی جلدی کوئی گاڑی چلو جاتی ہوگی۔لیکن یہ وقت ہمارے لئے زیادہ مناسب تھا۔

چکن کڑاہی اور دریائے سندھ کی مچھلی واقعی لذیذ بنی ہوئی تھیں۔کھانے کے بعد میں نے اس سفر کی پہلی جب کہ باقی حضرات نے چوتھی بوتل حلق سے نیچے انڈیلی اور سب سونے کے ارادے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

چھ گلیشیروں کی سرزمین میں

رات کو کسی وقت موسم بدلا تھا۔

بے سدھ نیند کے دوران کسی وقت میری آنکھ کھلی تو بارش کی آواز سنائی دی تھی۔اور جب کمرے کے دروازے پر زوردار دستک کی آواز پر یاسر نے دروازہ کھولا تو ہوٹل کے ویٹر کے ساتھ ہلکی بارش اور سرمئی بادلوں کا منظر نظر آیا۔ویٹر ہمیں جگانے آیا تھا کیونکہ ہم نے ہوٹل کے مالک سے درخواست کی تھی کہ صبح ہماری جلد روانگی ہے لہٰذا احتیاطاً ہمیں جگا دیجئے گا۔

وقت دیکھا تو گاڑی نکلنے میں چند منٹ رہ گئے تھے۔بھاگم دوڑ میں منہ پر چند چھینٹے مارے۔یاسر باہر گاڑی کی طرف بھاگا کہ چند منٹ انتظار کا کہہ آئے۔ہم نے فٹافٹ اپنے رک سیک اٹھائے اور میں ہوٹل کی ادائیگی کر رہا تھا کہ یاسر بھی آ گیا۔اپنا رک سیک اٹھا کر یاسر جب واپس آیا تو اس نے سر پر وہ تولیا ڈال رکھا تھا جو میں منہ دھونے اور خشک کرنے کے بعد بے دھیانی میں کرسی پر ہی ڈال آیا تھا۔

یاسر سردی سے کپکپا رہا تھا''یار باہر بہت سردی ہو رہی ہے۔میں اس تولئے کو سر پر لپیٹ کر رکھوں گا ابھی بیگ سے کچھ نکالنے کا وقت نہیں۔جلدی کرو''۔

اب ہمارا سفر ایک ویگن میں ہو رہا تھا۔

سکردو کے بازار سے نکلتے ہی دریا کے کنارے گندم کی فصلوں،خوبانیوں کے باغوں اور پتھر سے بنے اکا دکا مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔بارش بدستور ہو رہی تھی اور رات بھر کی پرسکون نیند کے بعد اب اس موسم میں ایک ہموار سڑک کا سفر منظر کو زیادہ دلنشیں بنا رہا تھا۔

سکردو سے خپلو تک کا فاصلہ ایک سو دو کلومیٹر ہے جو لگ بھگ تین گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے۔یہ سفر نسبتاً زیادہ محفوظ

اور دلچسپ ہے۔راستے میں سنگلاخ پہاڑوں، سرسبز درختوں، فصلوں اور پھلوں کے باغوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ دریائے سندھ پر متعدد پل ہیں جو بائیں ہاتھ پر بہتے دریا کے پار کی وادیوں تک رسائی کا ذریعہ ہیں۔کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد دریا کی وسعت میں مزید اضافہ نظر آنے لگا۔دریا یہاں دو شاخوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ بائیں طرف سے جو پانی آ رہا تھا وہ دریائے شیوک ہے۔جبکہ دریائے سندھ سامنے کی طرف ایک طویل موڑ کے بعد پہاڑوں کے ایک سلسلے میں غائب ہو رہا تھا۔

چند منٹ میں ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں دریائے سندھ کو ایک پل کے ذریعے پار کر کے ہم نے اس سے جدا ہو کر دریائے شیوک کی رفاقت میں باقی کا سفر طے کرنا تھا۔پل پر سے ہم نے دریائے سندھ کے گہرے، تیز رفتار اور گدلے پانی پر الوداعی نظریں ڈالیں جو ایک موڑ کے بعد نظروں سے اوجھل ہو کر چند کلومیٹر دور مقبوضہ کشمیر اور لداخ کے راستے تبت کی کسی دور افتادہ برفانی جھیل سے نکل کر آ رہا تھا۔

پل پار کر کے ایک پولیس چوکی پر گاڑی کچھ دیر کے لئے رکی۔ایک پولیس والے نے مسافروں پر نظر ڈالی اور ہمارے شناختی کارڈ دیکھنے کے بعد گاڑی کو جانے کا اشارہ کیا۔

گاڑی نے سفر شروع کیا تو اب دریائے شیوک ہمارے بائیں جانب آ چکا تھا۔دریائے شیوک کی وسعت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔سیاچن، ہوشے اور آس پاس کے بے شمار گلیشئر وں کا پانی اس دریا کی روانی کا سبب ہے۔

اب ہم گلگت بلتستان کے انتہائی مشرقی حصے میں تھے۔اور پل پار کرتے ہی ہم بلتستان کے گنگچھے ڈسٹرکٹ کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ایک مرتبہ کسی مقامی نے بتایا تھا کہ گنگ چھے کا مطلب ہے چھ گلیشیئر۔اس علاقے میں چھ بڑے اور کئی کم بڑے گلیشیئر موجود ہیں۔سیاچن گلیشیئر بھی اسی علاقے میں واقع ہے جس کے تعارف میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔اس کے علاوہ گونڈوگورو، چرسکا، النگ، ننگما، مشہ بروم اور چھوٹے گلیشیئر بھی ہیں جن میں سے کچھ کا نام ہے اور کچھ بے نام ہیں۔

گنگچھے کے شمال مشرق میں چین، مغرب میں مشہور وادی استور، جنوب میں مقبوضہ کشمیر اور شمال میں سکردو واقع ہیں۔اس طرح اب ہم پاکستان کی اس سرحد تک پہنچ چکے تھے جہاں ایک طرف دنیا کی ابھرتی سپر پاور چین اور دوسری طرف ظلم وستم کی دلدلوں میں ڈوبے کشمیر کا علاقہ ہے۔یہاں ایک انتہائی کم فاصلے پر دنیا کے دو ایسے خطے پاکستان سے متصل تھے جہاں کے انسان متضاد زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ایک تہذیب وترقی کی انتہاؤں کی طرف

گامزن اور دوسرے استبداد کی بے رحم چکیوں میں پسنے کے عادی!

دائیں ہاتھ پر بلند پہاڑوں کی ایک دیوار سڑک کے بالکل ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔بعض مقامات پر دلفریب آبشاریں بھی دیکھنے کو ملیں۔ایک آبشار نہایت بلندی سے براہ راست سڑک کی سطح پر گر رہی تھی۔بلند چٹان جو ایک چھجے کی طرح باہر کو نکلی ہوئی تھی سے جھلملاتا پانی بہت دور تک پھوار پھیلا رہا تھا۔یقیناً اوپر کہیں اچھی خاصی برف ہوگی جس کے پگھلنے سے یہ آبشار وجود میں آئی تھی۔میں نے اس سے زیادہ بلند آبشار اب تک کہیں نہ دیکھی تھی۔

گنگچھے میں سڑک کی حالت زیادہ اچھی نہیں۔لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی جس کی وجہ سے گاڑی کی رفتار کم تھی لیکن ڈرائیور مہارت سے ویگن چلاتا رہا۔

بارش تھم چکی تھی اور ہوا میں نمی اور خنکی بدستور برقرار تھی۔خوبصورت دیہاتی مناظر اور خوبانی، انگور اور شہتوت کے باغوں سے ہوتے ہوئے بالآخر ہم خپلو پہنچ گئے۔ایک چھوٹی سڑک دائیں طرف مڑی اور انتہائی تند چڑھائی کے بعد ایک چھوٹے سے پلاٹ میں ویگن رک گئی۔

مسافر اترے، سامان اتارا گیا___ ہم چار خانہ بدوش کھڑے رہے، باقی سب گھروں کو چلے گئے۔

یہ خپلو کا بازار تھا۔

سڑک کے دونوں طرف ٹین کی چھتوں والی دوکانیں اور اپنے اپنے معمولات میں مشغول لوگ۔ایک چھوٹے سے پرسکون بازار اور سادہ مکانات پر مشتمل اس آبادی میں ایک دو ہوٹل بھی نظر آئے جہاں بوقت ضرورت رہائش اختیار کی جا سکتی تھی۔یہاں سکردو کی طرح زیادہ چہل پہل نہیں تھی اور پہلا احساس یہی ہوتا تھا کہ ہم آج کی دنیا سے دور، گئے وقتوں کی کسی پرامن بستی میں اتار دیئے گئے ہیں۔

ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا اور ہمارا ارادہ تھا کہ آج شام تک ہوشے پہنچ جائیں۔سامان کو ایک طرف رکھا گیا اور فوری طور پر ہوشے کی کوئی گاڑی پکڑنے کی فکر ہوئی۔

زاہد اور یاسر غائب تھے۔

ادھر ادھر تلاش کرنے کے بعد وہ دونوں لکڑی کی دیواروں اور چھت والے ایک مختصر سے ہوٹل میں پائے گئے۔میز پر چائے کی پیالیاں بھی موجود تھیں۔ہمیں سامان کی چوکیداری پر کھڑا کر کے یہاں چائے اڑائی جا رہی تھی۔

''ہم نے سوچا ذرا جلدی جلدی چائے پی لیں، پھر آگے بھی جانا ہے۔'' اچانک چھاپہ پڑنے پر یاسر نے سر کھجایا۔

''دیکھو، نان، پراٹھا انڈہ کچھ بھی نہیں مانگا ہم نے۔'' زاہد نے بھی صفائی پیش کی۔

اتنے میں ایک کم عمر بلتی لڑکا موٹے موٹے بسکٹوں سے بھری پلیٹ میز پر رکھ کر چلا گیا۔

''عظیم صاحب، آجائیں۔ زاہد اور یاسر نے اپنے خرچے پر چائے کی دعوت دی ہے۔'' میں نے دروازے سے باہر سر نکال کر عظیم کو آواز دی جو سامان کے پاس کھڑا تھا۔

چائے کے ساتھ کسی مقامی بیکری کے تیار کردہ یہ بسکٹ مزیدار تھے۔ صبح کے دس بج رہے تھے اور بازار کے ان ہوٹلوں میں اس وقت ناشتے کے بجائے دوپہر کے کھانے کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔ اسی وجہ سے انڈہ، پراٹھا اور نان وغیرہ کی غیر موجودگی میں ہنگامی طور پر بسکٹوں کا آرڈر دیا گیا تھا۔

''چلو اب تم دونوں ہوشے کی گاڑی کا بندوبست کرو۔ میں اور عظیم سامان کے پاس ہیں۔'' میں نے عظیم کو ساتھ لیا اور سامان کے پاس آ گیا۔

جلد ہی یاسر اور زاہد بھی آ گئے۔ ''بندوبست ہو گیا ہے۔ ایک جیپ نکل رہی ہے، ہم نے اس میں چار بندوں کی جگہ کا کہہ دیا ہے۔'' یاسر نے بتایا۔

''کہاں ہے جیپ؟ ادھر لاؤ اتنا سامان اٹھا کر کیسے لے جائیں گے؟'' عظیم نے پوچھا۔

''وہ نیٹکو کا دفتر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سامان یہاں لے کر آئیں۔ آدھا گھنٹہ ہے ابھی۔'' یاسر نے ایک دوکان نما دفتر کی طرف اشارہ کیا جس کی چھت پر لگا بورڈ یہاں سے ترچھا نظر آنے کی وجہ سے پڑھا نہیں جاتا تھا۔

سامان نیٹکو کے دفتر پہنچایا گیا۔ بکنگ کرنے والے نے تسلی دی کہ سامان جیپ پر لوڈ کر دیا جائے گا اور آپ بے فکری سے آدھے گھنٹے تک خپلو کی سیر کر سکتے ہیں۔

کچھ ہی دیر میں ہم جیپ کے ذریعے ایک پر پیچ، پتھریلے اور قراقرم کے توڑ ڈالنے والے سفر پر نکلنے والے تھے۔

ہوشے کے پراسرار مینار اور مشہ بروم

خپلو اپنے نام کی طرح خوبصورت ہے۔

ایک ایسا قصبہ جہاں خوبصورت انسان ہیں___ حسین نظارے ہیں اور قدیم تبتی رنگ نظر آتے ہیں___

دریائے شیوک کے کنارے آباد اس قصبے میں مکمل لکڑی سے بنی بلتستان کی قدیم ترین مسجد بھی ہے اور خپلو کے سابقہ راجاؤں کی حویلی بھی۔ ڈھلوانی زمینوں پر خوبانی، شہتوت اور انگوروں کے باغات ہیں اور درختوں کے درمیان فصلوں کی کاشت ہوتی ہے۔ جگہ جگہ جھلملاتا پانی تر و تازہ گھاس اور فصلوں میں بہتا ہے۔ درختوں کے کسی بھی جھنڈ میں بیٹھ کر اردگرد اور دور دور تک کا دلفریب منظر جو اوپر کسی نیلگوں چوٹی سے شروع ہو کر دریائے شیوک کی وسیع گزرگاہ سے ہوتا ہوا پس منظر کے بھورے پہاڑوں پر ختم ہوتا ہے، لطافت اور انفرادیت میں اپنی مثال آپ ہے۔

خپلو، بلتستان کے ڈسٹرکٹ گنگچھے کا انتظامی مرکز ہے اور خاصی بلندی پر واقع ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جسے پاکستان کا سرد ترین مقام کہا جاتا ہے۔ سردیوں میں یہاں کا درجہ حرارت منفی بیس ڈگری سینٹی گریڈ سے بھی کم رہتا ہے۔ اسی وجہ سے خپلو کا دوسرا نام 'تیسرا قطب' بھی ہے۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی کے بعد اس جگہ کی سردی یقیناً ناقابل برداشت ہوتی ہوگی۔ لیکن ہم گرمیوں کے موسم میں یہاں آئے تھے اس لئے ان دنوں درجہ حرارت مثبت میں ہی تھا۔ بہرحال یہاں سکردو کی نسبت زیادہ ٹھنڈ تھی اور سبزہ بھی بہتات میں تھا۔

* * * * *

جیپ سے چھلانگیں لگاتے ہی ہم نے اپنے جسموں کے کس بل نکالنے شروع کئے۔ خپلو سے یہاں تک ایک پتھریلا سفر جسم کے اکثر حصوں کو سن کرنے کے لئے کافی تھا۔

ایک طویل انگڑائی لینے کے بعد میں نے باقی ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

عظیم ٹانگیں پھیلائے رکوع کی حالت میں اپنے پیروں کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ زاہد ایک ٹانگ زمین پر رکھتا اور دوسری اٹھا لیتا تھا اور ایک عجیب سی اچھل کود میں مصروف تھا۔ یاسر مسلسل بیٹھکیں نکال رہا تھا اور دو گھنٹے کے جسم کی چولیں ہلا دینے والے سفر کے بعد شاید ابھی بھی نہیں تھکا تھا۔

خپلو سے روانہ ہو کر ہم کچھ دیر پختہ سڑک پر دریائے شیوک کے ساتھ ساتھ چلے تھے اور پھر اس عظیم دریا کی چوڑائی پر تعمیر کئے گئے ہوا میں جھولتے ایک طویل پل سے پہاڑوں کی ان بھول بھلیوں میں داخل ہو چکے تھے جہاں سے اندر جانے کا تو دل کرتا ہے باہر آنے کا نہیں۔

پل پار کرتے ہی سلنگ کا علاقہ شروع ہوا جہاں پہلے ریت اور بعد میں پاپلر کے بلند درخت ماحول پر چھائے ہوئے تھے۔ راستے کے دونوں طرف مکانات اور احاطے تھے جن میں خوبانی کے درخت پتھریلے راستے پر جھکے ہوئے تھے۔ سلنگ کے بعد راستہ بلند ہونا شروع ہوا تھا اور مچلو اور ایسے ہی کئی دوسرے چھوٹے بڑے گاؤں راستے میں آتے رہے تھے۔

مچلو کے کسی موڑ سے آسمان کو چھوتی اور بادلوں میں چھپی ایک چوٹی پہلی بار نظر آئی تھی۔ یہ مشہ بروم تھی ہوشے کی پہچان اور قراقرم کی عظمت کا نشان۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے اطراف کے پہاڑی سلسلے بھی تنگ ہوتے گئے اور دائیں بائیں کچھ فاصلے پر اونچی دیواروں کی طرح نظر آنے لگے۔ یہ وادی ہوشے تھی جو سلنگ سے شروع ہوئی اور ہوشے گاؤں اس وادی کے آخر میں آتا تھا۔

فرنٹ سیٹ پر میں اور زاہد بیٹھے تھے جبکہ جیپ کے پچھلے کھلے حصے میں یاسر اور عظیم دیگر مسافروں کے ساتھ تھے۔

اس سفر میں ایک مرتبہ پھر اسی تجربے سے واسطہ پڑا جو اس علاقے کا معمول ہے۔ خپلو سے روانگی کے وقت خاصی تعداد میں مسافر اور سامان جیپ پر لاد دے گئے تھے۔ اچھلتے کودتے اس راستے پر ہر وقت ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی اچھل کر یا پھسل کر نیچے نا جا گرے۔ اور اس راستے پر نیچے گرنے کا مطلب جیپ سے گرنا نہیں بلکہ ایک لمبی کھائی میں پتھروں سے ٹکراتے ہوئے دریائے ہوشے میں گرنا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے ایسا کوئی ناخوشگوار حادثہ نہیں ہوا۔

''بھئی جسم سن ہو گیا۔ تم لوگوں کے کیا حالات ہیں؟'' جیپ کے رکنے اور جسم کا دوران خون بحال کرنے کے بعد میں نے یاسر اور عظیم سے پوچھا۔

''اے ون!'' یاسر نے مٹھی بند کر کے انگوٹھا سامنے کیا۔

''آہو، فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر تمہیں کیا فکر۔ ادھر پیچھے بیٹھو تو خود پتہ لگ جائے گا۔'' زاہد کو سفر نے کافی ستایا تھا۔

''یار ایسی بات نہیں۔ سارے راستے میں سوچتا رہا کہ خدانخواستہ کھلی جیپ سے کسی جھٹکے پر کوئی نیچے دریا میں نا گر جائے۔'' میں نے ہمدردی جتانے کی کوشش کی۔

''ہیں؟ وہ کیوں؟ تم نے دیکھا نہیں کہ سامان اور مسافر کتنی مہارت سے جیپ میں بھرے گئے ہیں۔ میں تو سارے راستے ہل بھی نہیں سکا، تو کوئی اچھلتا کیسے؟ اور گرتا کیسے؟'' یاسر کا موڈ خراب ہونے لگا۔

جس جگہ ابھی ہم ٹھہرے تھے یہاں دریائے ہوشے خاصی گہرائی میں ہمارے دائیں جانب بہہ رہا تھا اور دریا کی دوسری جانب ایک سرسبز گاؤں پہاڑوں کے دامن میں ایک گول تخت کی شکل میں دکھائی دے رہا تھا۔ ایک گولائی کے اندر گندم کی فصل جو ابھی سبز تھی اور فصل کے پیچھے چند کچے مکان اور پھر ایک دم آسمان کی طرف بڑھتی بھوری دیوار جس کے کنارے کبھی برابر نہیں ہوتے بلکہ اونچے میناروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔

ہمارے قریب ہی ایک کچا راستہ نیچے ایک رسوں کے پل پر سے ہوتا ہوا گاؤں تک جا رہا تھا۔ راستے کے آغاز پر ایک بورڈ پر گاؤں کا نام لکھا ہوا تھا۔

'کھانے'

اب یہ نہیں معلوم کہ یہاں کے لوگ کھانا پکاتے بہت اچھا ہیں یا کھاتے زیادہ ہیں بہرحال اس 'کھانے' کو دیکھ کر جو سرور مل رہا تھا وہ ہمیں کسی بھی لذیذ طعام سے زیادہ مرغوب تھا۔

ڈرائیور نے کچی سڑک کے ساتھ ساتھ بہتی ایک نالی سے صاف پانی لیا اور جیپ کے ریڈی ایٹر میں ڈالنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد ہم دوبارہ سفر پر روانہ ہو چکے تھے اور 'کھانے' پہاڑوں کے اس پر پیچ راستوں پر کسی موڑ کے پیچھے گم ہو چکا تھا۔

ہوشے کا یہ علاقہ اپنے مشہور زمانہ گرینائٹ ٹاورز کی وجہ سے ایک 'فینٹسی ورلڈ' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کہیں سے بھوری اور کہیں سے سنہری بلند نوکیلی چٹانیں کسی طلسماتی دنیا کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ ایک ایسی دنیا جس میں پراسراریت اور اپنے اندر کھینچ لینے والی کشش موجود ہے۔ یہ چٹانیں ہمارے دائیں ہاتھ پر دریا کے پار تھیں اور جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے ان کی بلندی میں متواتر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان چٹانوں کے مینارے اس قدر نوکیلے تھے کہ انتہائی بلندی کے باوجود ان پر برف کے ٹھہرنے کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا تھا۔ اور جہاں برف بھی نہ ٹھہرے

وہاں انسانی قدم کیسے پہنچ سکتا ہے۔کوئی بھی اس پرکشش اور پراسرار منظر کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کچھ سفر کے بعد ہم' کاندے' پہنچ گئے۔

کاندے ہوشے سے پہلے ایک مشہور گاؤں ہے۔یہاں سے بعض کوہ پیما اور ٹریکنگ ٹیمیں' کے سکس' اور' کے سیون' کے لئے اپنی مہموں کا آغاز کرتی ہیں۔کے سیون کا دوسرا نام بلتستان پیک بھی ہے۔ان چوٹیوں کے لئے ہوشے سے بھی جایا جاسکتا ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ کاندے کی سمت سے ان چوٹیوں کا منظر زیادہ واضح ہے۔قراقرم کی ان خوبصورت چوٹیوں کی وجہ سے کاندے میں بھی کوہ پیماؤں اور راک کلائمبرز کی ٹیمیں موجود رہتی ہیں۔

اس کے علاوہ اس گاؤں کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ یہاں سے آگے ہوشے تک کے لئے آپ کو جیپ بدلنی ہوتی ہے۔کچھ برس قبل ایک شدید لینڈ سلائیڈنگ ایک تندنالے پر قائم پل اور بہت سے گھروں کے اپنے ساتھ لیتی ہوئی دریا میں جا گری تھی۔یہ پل ہوشے تک جانے والے راستے پر قائم کیا گیا تھا جس کے ٹوٹنے کے بعد جیپیں آگے نہیں جاسکتیں۔بعض جیپ ڈرائیوروں نے کسی طرح ایک دو جیپیں دوسری طرف پہنچائی ہیں جہاں سے وہ مسافروں کو ہوشے تک لے جاتے ہیں۔

جیپ سے اتر کر ہم نے سامان اتارا اور سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی دیوار کے ساتھ اکٹھا کر کے رکھ دیا۔

سامان اتار کر کچھ دیر آرام کرنے اور دوسری جیپ کے بندوبست کے خیال سے ہم قریب ہی ایک مکان نما ہوٹل میں داخل ہوئے۔لکڑی کے ایک تختے پر' کے سیون ہوٹل' کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔اس ہوٹل میں بھی سادگی نمایاں تھی لیکن لکڑی کی کھڑکیوں سے باہر کا منظر شاندار تھا۔دیواروں اور کھڑکیوں پر جہاں کہیں جگہ موجود تھی کوئی نہ کوئی پوسٹر یا سٹکر ضرور موجود تھا۔تمام سٹکر اور پوسٹر خوبصورت چوٹیوں اور مختلف مہمات کے دوران لئے گئے مناظر سے بھرپور تھے۔

اس طرح کے ماحول میں ایسی تصاویر ہمیشہ ہمارے اندر کی کیفیت میں ایک سنسنی اور جذبہ بیدار کرتی ہیں۔بہت سی نئی چوٹیوں اور دروں اور گلیشیئر وں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔اور پھر ان نئی دریافتوں تک پہنچنے کا خیال کسی اگلی منزل کے تعین میں مدد دیتا ہے۔

دیوار پر لگے ایک بڑے پوسٹر نے خصوصی طور پر ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

پوسٹر کے ایک طرف جلی حروف میں' امین براک' لکھا ہوا تھا۔یہ ایک سر بفلک چٹان تھی جسے کسی ماہر فوٹو گرافر نے

سورج غروب ہوتے وقت کیمرے میں محفوظ کر لیا تھا۔امین براک وادی ہوشے کے طلسماتی میناروں میں بلند ترین ٹاور ہے۔اس کی بلندی پانچ ہزار آٹھ سو پچاس میٹر ہے۔یہ ایک ایسی عمودی دیوار ہے جس سے پتھروں اور برف کا گرنا ایک معمول ہے۔اس کے بیس کیمپ کی بلندی چار ہزار دو سو پچاس میٹر ہے۔بیس کیمپ سے یہ چٹان بالکل سیدھی بارہ سو میٹر آسمان کی طرف اٹھتی ہے۔ان تمام خصوصیات کی وجہ سے امین براک کو دنیا کی سب سے مشکل چٹان کہا جاتا ہے۔بالترو گلیشیئر پر واقع ٹرانگو ٹاورز اور کیتھیڈرل چٹانوں کے بعد امین براک کی شہرت سب سے زیادہ ہے۔یہ چٹان ایک مقامی باورچی' امین' کے نام سے منسوب ہے جس کی مہارت اور بہادری کے باعث ایک ہسپانوی ٹیم انیس سو ننانوے میں پہلی مرتبہ اس دشوار چٹان کو سر کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

امین براک کو سر کرنے کے لئے کئی ٹیمیں ہر سال کاندے کا رخ کرتی ہیں۔اکثر خراب موسم اور شدید مشکلات کے باعث ان ٹیموں کو کئی کئی ہفتے بیس کیمپ میں ہی رہنا پڑتا ہے۔راک کلائمبرز کے لئے اس عظیم عمودی دیوار پر چڑھنا ایک خواب کی حیثیت رکھتا ہے۔اسی لئے نامور راک کلائمبرز اپنی صلاحیتوں اور قسمت کو آزمانے کے لئے کاندے کو اپنی مہم کی آخری تیاریوں کا مرکز سمجھتے ہیں۔کاندے سے چھ سات گھنٹے جیپ کے ذریعے اور پھر دو دن کے پیدل سفر کے بعد امین براک کے بیس کیمپ تک پہنچا جاسکتا ہے۔چونکہ اس چٹان کی بلندی چھ ہزار میٹر سے کم ہے اس لئے حکومت کے قوانین کے مطابق اس کو سر کرنے کی کوئی رائلٹی وغیرہ نہیں ہے۔چھ ہزار میٹر سے بلند چٹانوں اور چوٹیوں کو سر کرنے کے لئے غیر ملکیوں کو حکومت پاکستان سے پیشگی اجازت لینی ہوتی ہے۔

ہم اس چھوٹے سے ہوٹل کے ڈائننگ روم کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ایک دروازے کے دوسری طرف نیلے رنگ کے پلاسٹک کے ڈرم ایک ترتیب سے اوپر نیچے رکھے ہوئے تھے۔شاید یہ کسی ایکسپی ڈیشن کا سامان تھا۔پوچھنے پر معلوم ہوا کہ چیک ری پبلک سے چھ لوگوں کی ایک ٹیم بلتستان پیک سر کرنے کی مہم پر آئی ہوئی ہے۔کل صبح اس ٹیم کی اپنی مہم پر روانگی تھی۔

چائے پینے کے بعد سامان اٹھا کر ہم تباہ شدہ پل پر پہنچے۔

پل کا تو دور دور تک کوئی نشان نہ تھا البتہ ایک شہتیر نہایت تندرفتار گہرے نالے پر رکھا ہوا تھا۔نالے سے جتنی رفتار سے پانی آرہا تھا اس سے کہیں زیادہ تیز ہوا بھی چل رہی تھی اور ایک تنگ شہتیر پر سے گزرنا جس کے نیچے یخ اور شور مچاتا پانی گزر رہا ہو، دشوار نظر آتا تھا۔بہرحال گزرنا تو تھا۔ایک ایک کر کے سامان سنبھالتے اور ہوا سے ڈولتے

ہوئے بمشکل یہ مرحلہ سر کیا۔

یہ نالا اوپر کسی پگھلتے گلیشیئر کا پانی لئے آ رہا تھا اور تین چار سو میٹر آگے دریائے ہوشے میں شامل ہو رہا تھا۔ نالے کے ایک طرف وہ میدان تھا جہاں کچھ عرصہ قبل تک اچھے خاصے مکانات آباد تھے۔ ایک معجزاتی چیز جو ہم نے یہاں دیکھی وہ یہ تھی کہ جس میدان میں بہت سے مکانات کے منہدم ہونے کے نشانات ابھی تک باقی تھے اس کے درمیان میں ایک تبتی نقش و نگار والی مسجد مکمل حالت میں قائم تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ لینڈ سلائیڈنگ نے اردگرد کی تمام آبادی کو ملیا میٹ کیا لیکن اللہ کے گھر کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔

تھوڑی ہی دور ایک جیپ کھڑی نظر آ رہی تھی۔ قریب پہنچے اور ڈرائیور سے معاملات طے کرنے کی کوشش کی۔ کافی دیر کی کوشش کے بعد ہم اس کے طلب شدہ معاوضے پر ہی رضامند ہو گئے! ہمارا کوئی حربہ اس مرتبہ کام نہ آیا کیونکہ ڈرائیور کا کہنا تھا کہ آپ بیشک پاکستانی ہو یا انگریز جیپ کا کرایہ سب کے لئے برابر ہے یعنی چند کلومیٹر کا پندرہ سو روپے!

سفر دوبارہ شروع ہوا اور ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں ہم ہوشے کے بازار میں اپنے سامان سمیت پہنچا دیئے گئے۔ یہ ہماری وہ منزل تھی جہاں سے آگے جتنا بھی سفر تھا وہ پیدل ہونا تھا۔

یہاں سے آگے وہ سفر تھا جس میں آپ اکیلے ہوتے ہیں۔ قدرت کے ہر اسرار اور حسن کے آشکار ہونے پر بھی اور کسی اچانک پیش آنے والی اذیت ناک صورتحال میں بھی۔ آپ ایک ٹیم کی شکل میں تو ہوتے ہیں لیکن اکثر مشکل فیصلے آپ نے خود کرنے ہوتے ہیں۔ پتھروں میں راستے کا انتخاب ہو یا تیز رفتار ندی کو پار کرنے کا فیصلہ، کسی برفانی کھائی کو پھلانگنے کا معاملہ ہو یا تھکاوٹ میں پیچھے رہ جانے کے بعد اپنی منزل پر پہنچنے کی کوشش۔ بہت سے مقامات پر انسان کو اپنی قوت فیصلہ اور ان خوابیدہ و پوشیدہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے جن سے وہ پہلے آشنا نہیں تھا۔

ٹریکنگ بالحقیقت اپنی دریافت کا ایک منفرد راستہ ہے۔ اپنی خوبیوں اور خامیوں کو جاننے کا بہترین ذریعہ ہے۔ روزمرہ کے آرام اور آسائشوں سے دور کسی ویرانے میں فطرت کی کسوٹی پر اپنے آپ کو پرکھنے کا ایک موقع ہے جو خود شناسی اور پھر قدرت شناسی کی طرف انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔

ہوشے پہنچتے ہی پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ شاید ہم کئی صدیوں پہلے کے کسی منظر کا حصہ بن گئے ہیں۔ کچے راستے کے اردگرد کچے مکان اور مکانوں کی دیواروں سے ٹیک لگائے دھوپ سینکتے بوڑھے۔ گلیوں میں چگتی مرغیاں اور

جیپ کے واپس جاتے ہی انتہائی پرسکون خاموشی۔ سامنے سفید چمکدار مشہ بروم پہاڑ پر ہر دم اڑتی اترتی بدلیوں کا دلنشیں منظر۔ اور اس منظر سے نیچے گاؤں کے گہرے سبز کھیت جو نکھری نکھری دھوپ میں جب ہوا سے لہلہاتے ہیں تو قدرت کی دلفریبی ذہن پر نقش ہو جاتی ہے۔

دھوپ سینکتے بوڑھوں نے آگے بڑھ کر ہم سے مصافحہ کیا اور ہمیں پاکستانی دیکھ کر حیران سے ہوئے۔ خشک جلدیں اور جسم پر پھٹے پرانے کپڑے ان کی مفلوک الحالی کی تمام داستانیں بیان کر رہے تھے۔ ایک طرف چند ملکی اور غیر ملکی اداروں کی طرف سے علاقے کی فلاح و بہبود کے لئے اٹھائے گئے اقدامات اور اعلانات پر مشتمل بورڈ نصب تھے لیکن ان دعووں اور ہمارے سامنے کھڑے ان انسانوں کی حالت میں کوئی چیز مشترک نظر نہ آتی تھی۔

ہوشے اور شگر بلتستان کی وہ وادیاں ہیں جن کی بدولت پاکستان کا شمار غیر معمولی بین الاقوامی سیاحتی مقامات کے طور پر کیا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں وادیوں کو آج تک نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

شگر کی وادی ایک تو سکردو سے نزدیک ہونے کی وجہ سے اور دوسرا سیاحوں کی توجہ کا بڑا مرکز ہونے کے سبب نسبتاً بہتر سہولیات سے آراستہ ہے۔ کے ٹو اور بالتورو کی تقریباً تمام مہمات شگر سے ہی شروع کی جاتی ہیں۔ زیادہ سیاحوں کی آمدورفت کے باعث یہاں کے لوگوں کو روزگار کے بہتر مواقع میسر ہیں۔ اس کے علاوہ شگر کے لوگوں کی تعلیمی قابلیت بھی بہتر ہے۔ اور کئی شگری اپنی تعلیم اور قابلیت کی بنا پر اہم سرکاری اور نجی اداروں میں اپنا کردار بھی ادا کر رہے ہیں۔

ہوشے کا معاملہ شگر کی نسبت خاصا مختلف ہے۔ سکردو سے دوری کی وجہ سے سیاحوں کی آمدورفت شگر کے مقابلے میں کہیں کم ہے۔ بیشک مشہ بروم، چوگولیزا، کے سکس، کے سیون، نغمہ ویلی، گونڈوگورو پاس اور امین براک جیسے پرکشش نام غیر ملکی کوہ نوردوں اور ایڈونچر شائقین کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، لیکن یہ پسماندہ علاقہ بہرحال وہ سیاحتی مقام حاصل نہیں کر سکا جو اس کے شایان شان ہے۔ روزگار کے کم تر مواقع، زرعی زمین کی کمی اور تعلیمی سہولیات کا فقدان اس علاقے کی پسماندگی کی بنیادی وجوہات ہیں۔

وادی ہوشے میں جو قدرتی رنگینیاں ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی کسی اور ملک کے پاس ہوتی تو اس ملک کی معیشت کے لئے اہم اثاثہ ثابت ہوتی۔ لیکن ہمارے پاس تو ایسا بہت کچھ ہے اور ایک ہوشے میں ہی کثرت سے ہے تو پھر کیسا اثاثہ!

بس جی اللہ کا دیا بہت کچھ ہے!

ان احساسات کے ساتھ ہم چند قدم پر واقع 'گونڈوگورو ریسٹ ہاؤس' کے گیٹ سے اندر داخل ہو کر احاطے میں رکھی کرسیوں پر ڈھیر ہو گئے۔ یہ ریسٹ ہاؤس راستے کے دائیں ہاتھ پر تھا۔ ایک چار دیواری کے اندر آٹھ دس کیمپ لگانے کی جگہ تھی اور آگے ایک ہال نما کمرہ تھا۔ ہال کے قریب ہی ایک چھوٹا کیمپ لگا ہوا تھا۔ یہ ریسٹ ہاؤس کیمپنگ کے لئے ہی تھا، رہائش کے کمرے وغیرہ موجود نہیں تھے۔

''میں منہ ہاتھ دھو آؤں، اس راستے نے تو بھوت بنا دیا ہے۔''، عظیم نے ہم تینوں کی طرف دیکھا اور ایک طرف لگے نلکے کی طرف بڑھا۔

اس خشک اور پتھریلے راستے پر جیپ کے ٹائروں سے جا بجا گرد اڑتی تھی۔ جیپ میں سوار تمام مسافر اس گرد سے بھرپور حصہ وصول کرتے رہے تھے۔ اور ہوشے پہنچتے پہنچتے یہ گرد ہمارے کپڑوں اور جسم کے تمام کھلے حصوں پر بری طرح جمی ہوئی تھی۔

ریسٹ ہاؤس کے ایک ملازم نے پانی کا ایک جگ اور دو گلاس لا کر میز پر رکھ دیئے۔ عظیم ہاتھ منہ دھو کر آ گیا تھا اور اب یاسر نلکے کے پاس بیٹھا صابن کے ایک گھسے ہوئے ٹکڑے سے جھاگ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی تک ہم نے سامان نہیں کھولا تھا اور صابن پتا نہیں کس بیگ کے کس کونے یا جیب میں پڑا ہوا تھا۔ فوری طور پر بغیر صابن جس حد تک منہ ہاتھ دھل سکتے تھے دھو لئے گئے۔

جونی اردو بولتا ہے

ہوشے میں گونڈوگورو ریسٹ ہاؤس میں اس موقع پر ہمارے ساتھ ایک دلچسپ 'ہاتھ' ہوا۔ اور یہ 'ہاتھ' ہوا بھی ہماری اپنی حرکتوں کے باعث!

ریسٹ ہاؤس کے ہال سے دو غیر ملکی لڑکے برآمد ہوئے اور ایستادہ کیمپ کے پاس پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ریسٹ ہاؤس کے لان میں لگا یہ اکلو کیمپ بھی غالباً انہی کا تھا۔ ان میں سے ایک طویل قامت اور دبلا پتلا تھا جبکہ دوسرا میانہ قد اور تندرست جسم کا مالک تھا۔

غیر ملکی سیاحوں میں دلچسپی لینا زاہد اور عظیم دونوں میں مشترک تھا۔ کسی غیر ملکی کو دیکھ کو ان دونوں میں تجسس کی ایک لہر اٹھتی تھی جو کبھی مختصر اور کبھی تفصیلی تبادلہ خیال کی صورت بھی اختیار کر جاتی تھی۔

یاسر اور عظیم ان غیر ملکی لڑکوں کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ نظریں ملنے پر 'ہیلو، ہائی' کی گئی جو ہر سیاح دوسرے کو دیکھ کر اخلاقاً کرتا ہے۔ ہاتھ منہ دھو کر واپسی پر میری اور زاہد کی کمر ریسٹ ہاؤس کے ہال کی طرف ہو گئی تھی اس لئے ہم نے بھی مڑ کر 'ہیلو' کہا۔

''اوئے، مجھے یہ لمبا تو 'وہ'۔۔۔لگ رہا ہے!'' چند لمحے کی خاموشی کے بعد یاسر نے عظیم کی طرف دیکھ کر کہا۔ 'وہ' کہتے ہوئے اس کا لہجہ خاصا ذو معنی تھا۔

''ہوں۔۔حرکتیں تو اس کی عجیب سی ہیں۔'' ایک وقفے کے بعد عظیم نے بھی شبہے میں اضافہ کیا۔

ایسی بات پر تجسس ابھرنا قدرتی امر تھا۔ لہٰذا میں نے اور زاہد نے بیک وقت مڑ کے دیکھا کہ یہ 'وہ' سے کیا مراد ہو سکتی ہے۔ جس لڑکے کے بارے میں شک کا اظہار کیا گیا تھا وہ پہلے ہی ہماری طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ بھی تھی۔ ایک نظر دیکھنے میں بظاہر تو معاملہ سمجھ نہیں آیا اس لئے ہم پھر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''ہے نا؟ کچھ زنانہ سی حرکتیں نہیں ہیں اس کی؟'' یاسر نے مجھ سے بھی تصدیق چاہی۔

''پتہ نہیں خیر چھوڑو یار، اگر ہے بھی تو ہمیں کیا۔۔کوئی اور بات کرو'' میں نے موضوع بدلنا چاہا۔

''آہو یار، یہ تو بیٹھے کے بھی ڈانس کرتا ہے اوئے!'' زاہد کی آواز میں خوامخواہ جوش آ گیا۔تجسس نے اسے پھر مڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا تھا اور اب اس نے کرسی کو ترچھا بھی کر لیا تھا۔

اسی لمحے کسی بات پر وہ غیر ملکی لڑکے بھی اونچی آواز میں ہنسے اور میں نے بھی پھر مڑ کر دیکھا۔اس مرتبہ میں نے نظر بھر کر ان لڑکوں کا جائزہ لیا۔جس لڑکے کے بارے میں ابھی طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں وہ کم از کم ایک ڈانسر ضرور تھا۔کیونکہ اب کوئی گانا گنگناتے ہوئے وہ اپنے بازوؤں کو رقص کے انداز میں بڑی فن کاری سے ہلا رہا تھا۔

''ویسے ہمیں اس طرح کسی کو پوائنٹ آؤٹ نہیں کرنا چاہئے۔وہ کیا سوچیں گے ہمارے بارے میں'' عظیم کو بھی میز کا خیال آ گیا۔

''ویسے یہ ان پہاڑوں میں کیا لینے آیا ہے؟ اس کے تو اور بڑے شوق ہوں گے!'' زاہد نے مزید مشکوک بات کی۔

وہ لڑکے ایک مرتبہ پھر ہنسے۔اور اس دفعہ ہم نے محسوس کیا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ہمارے قابل اعتراض فقروں کے ساتھ ہی ان کی ہنسی یقیناً اتفاقی نہیں ہو سکتی تھی۔

چند لمحے کے لئے خاموشی چھائی رہی۔

''کیا آپ اردو سمجھتے ہیں؟'' عظیم نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ انگریزی میں سوال کیا۔

''جی ہاں! تھوری تھوری'' لمبے قد والے لڑکے کے اردو میں جواب نے ہم پر سکتہ طاری کر دیا۔

''لے دس، یہ۔۔تو اردو بولتا ہے!'' زاہد کرسی سے گرتے گرتے بچا اور فوراً گلاس میں پانی بھر کر پینے لگا۔

اس کی اردو صاف نہیں تھی لیکن کیا یہ کم تھا کہ وہ ہماری بات سمجھ کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں ہی صحیح، جواب تو دے رہا تھا۔یہ ایسی صورتحال تھی جس سے دوچار ہونے کے بعد خفت، حماقت اور لطافت کے ملے جلے تاثرات ہم سب پر چھا گئے۔سب احمقوں کی طرح ایک دوسرے کو تکتے۔اب مشکل یہ تھی کہ ڈھنگ کی کوئی بات ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔لیکن کچھ بات بنانا بھی ضروری تھا۔

''اگر آپ نے کوئی بات محسوس کی ہو تو ہم شرمندہ ہیں!'' میں نے کرسی موڑ کر موقع کی مناسبت سے معذرت چاہی۔

''نہیں، مجھے برا نہیں لگا۔ہم انجوائے کر رہے تھے'' لڑکے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔دوسرے لڑکے کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔

''آپ ادھر پاکستان میں ہی رہتے ہیں یا اردو سیکھی ہے آپ نے؟'' زاہد نے شرمندگی اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سوال کیا۔

''میں انڈیا میں رہتا ہوں۔بمبئی میں۔وہاں فلموں میں کام کرتا رہتا ہوں اس لئے کچھ اردو بول لیتا ہوں لیکن سمجھ سب لیتا ہوں!'' لمبے قد کے لڑکے نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اب ہمارے لئے یہ سمجھنا مشکل نا تھا کہ ہماری تمام باتیں ان لڑکوں نے سمجھی تھیں اور یہ وہ بات تھی جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نا تھی۔

''اچھا! تو اگر آپ فلموں میں کام کرتے ہیں تو یہاں کیسے آ گئے؟'' زاہد کو مزید حیرت ہوئی۔

''بس دیکھنے آئے تھے پاکستان۔میرے دوست کو پہاڑوں کا شوق ہے۔اس لئے۔''

یہ دونوں لڑکے ایک ڈیڑھ سال سے انڈیا میں رہ رہے تھے۔لمبے قد والے لڑکے نے اپنا نام 'جونی' بتایا اور وہ اصل میں امریکی تھا۔اس کا دوست 'فلپ' فرانسیسی تھا لیکن امریکا اور انڈیا میں رہنے کی وجہ سے انگریزی اور کچھ اردو بھی جانتا تھا۔یہ دونوں دوست اسکولے سے کنکورڈیا اور پھر گونڈوگورو سے ہوشے آئے تھے اور آرام کی غرض سے یہاں خیمہ زن تھے۔

کچھ دیر دوستانہ انداز میں بات چیت کے بعد جونی اور فلپ آرام کے لئے اپنے کیمپ میں چلے گئے۔

یہ دن کے تین بجے کے لگ بھگ کا وقت تھا۔ریسٹ ہاؤس کے سامنے راستے پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد غیر ملکیوں اور پورٹروں پر مشتمل کچھ ٹیمیں نظر آتیں اور آس پاس کے کسی ریسٹ ہاؤس یا کیمپنگ گراؤنڈ میں غائب ہو جاتی تھیں۔

ہوشے میں چار دیسی مسافروں کے آنے کی خبر پھیل چکی تھی۔اور اب بہت سے لوگ جن میں بوڑھے جوان سب ہی شامل تھے مزدوری کی آس پر ہمارے اردگرد جمع ہو چکے تھے۔ہوشے پہنچتے ہی ہمارا پہلا کام پورٹروں کا بندوبست تھا لیکن اتنے لوگوں میں سے مناسب پورٹروں کا انتخاب آسان نہ تھا۔اس لئے ہم نے مناسب الفاظ میں ان لوگوں کو واپس بھیجا تا کہ ذرا اطمینان سے کچھ فیصلہ کریں۔سکردو میں پورٹروں کی کمی مسئلہ تھی یہاں زیادتی!

ریسٹ ہاؤس کا ملازم قریب ہی تھا، بلا کر اسے کھانا لانے کا کہا گیا۔ ہمیں امید تھی کہ جتنی دیر میں ہم کھانا کھائیں گے اتنے میں جمع ہونے والوں کی تعداد میں شاید کچھ کمی ہو جائے۔

بلندیوں کے بلند لوگ

ابھی ہم کھانے وغیرہ سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ چند غیر ملکیوں اور بہت سارے مقامی پورٹروں پر مشتمل ایک ٹیم ریسٹ ہاؤس کے احاطے میں داخل ہوئی۔

پورٹروں نے دھڑا دھڑ سامان ایک طرف ڈھیر کرنا شروع کیا اور خیمے ایستادہ کرنے لگے۔ غیر ملکیوں نے 'ہیلو، ہائی' کے بعد چند کرسیوں پر قبضہ جما لیا اور خیموں کے نصب ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ اس ٹیم میں مرد و خواتین سب ہی شامل تھے۔

ایک خوش وضع نوجوان جو ہیٹ اور بڑے بڑے سن گلاسز پہنے ہوئے تھا، اچانک ہماری طرف آیا۔

''اسلام علیکم''

حلیے سے تو وہ پاکستانی نہیں لگتا تھا لیکن اس کے سلام سے ہم ہڑبڑائے اور سب نے اٹھ کر ہاتھ ملایا۔

''آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے'' ایک کرسی پر اطمینان سے بیٹھ کر اس نے ہیٹ اتارا اور سر سہلاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔

''آپ اور یہ بھائی کیا پہلے بھی ادھر آئے ہیں؟'' اس نے یاسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی پچھلے سال ہم مشہ بروم بیس کیمپ گئے تھے تو یہاں ٹھہرنا ہوا تھا''۔ میں نے حیرت سے جواب دیا۔

''آپ لوگ شاید وہ سامنے والے کیمپنگ گراؤنڈ میں کچھ دیر کے لئے آئے تھے میں نے وہاں آپ کو دیکھا تھا''۔

میں نے دماغ پر زور دیا اور اس نوجوان کی یادداشت کی دل ہی دل میں داد دی۔

پچھلے سال میں اور یاسر کیمپنگ کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھے اور آس پاس کی تمام جگہوں کو دیکھ کر اسی ریسٹ ہاؤس میں آ گئے تھے۔ لیکن یہ بمشکل دو تین منٹ کا وقفہ تھا جس میں ہم اس کیمپنگ گراؤنڈ میں گئے اور اس

نوجوان نے ہمیں دیکھا ہوگا اور ابھی ہمیں دیکھتے ہی اسے وہ سب یاد آ گیا تھا۔

''جی۔۔آپ نے بالکل صحیح پہچانا، کیا آپ بھی ٹریکنگ وغیرہ کے لئے آتے ہیں؟''

''اصل میں میں گائیڈ ہوں اور مختلف ٹیموں کو لے کر ادھر آتا جاتا رہتا ہوں۔ابھی یہ ٹیم بھی کنکورڈیا سے ادھر آئی ہے۔میرا نام محبوب ہے، آپ لوگوں کا کیا ارادہ ہے اس دفعہ؟''

ایک پیشہ ور گائیڈ کا اس دوستانہ ماحول میں ملنا ہماری خوش قسمتی تھی۔ہم نے اپنے پلان کے بارے میں محبوب سے مشورہ کرنا مفید سمجھا اور مختصراً گونڈوگورو کے راستے کنکورڈیا جانے کے بارے میں بتایا۔

''زبردست! آپ لوگوں کے شوق کو دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ لوگ اپنا ٹریک مکمل کر لیں گے۔ادھر سے واپس آنے والے تو بہت ہیں لیکن گونڈوگورو پاس سے کنکورڈیا بہت ہی کم لوگ جاتے ہیں۔ ویسے اس دفعہ یہ کچھ زیادہ ہی مشکل ہے کیونکہ میں نے اس سے پہلے اتنی سنو کبھی نہیں دیکھی گونڈوگورو پاس پر اور دونوں طرف۔''

محبوب کی بات سن کر ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

کچی برف پر چلنا تو مشکل ہے ہی لیکن اس سے کہیں زیادہ خطرناک گلیشیئر کی وہ برفانی کھائیاں ہوتی ہیں جو نرم برف کے نیچے چھپی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں اور قدم رکھنے پر ہی ان کا پتہ چلتا ہے۔لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے!

عموماً جولائی کے مہینے تک گلیشیئروں کے اوپر کی یہ کچی برف بہت حد تک پگھل چکی ہوتی ہے۔اس کا فائدہ ایک تو یہ ہے کہ چلنے میں آسانی ہو جاتی ہے اور دوسرا یہ کہ چھپے ہوئے موت کے وہ غار جسے دراڑیں، کھائیاں یا کریوس کچھ بھی کہہ لیں، سامنے آ جاتے ہیں۔اس سال شاید سردیوں کے موسم میں برف باری بہت زیادہ ہوئی یا گرمیوں میں بھی موسم کی خرابی کے باعث برف گرتی رہی ہوگی۔

''ہیں جی، اچھا! کتنی برف ہوگی جی وہاں؟'' زاہد کو ابھی سے سردی لگنا شروع ہو گئی۔

''تقریباً دو فٹ تو ہے اور بعض جگہ زیادہ بھی ہے۔اس دفعہ ٹورسٹ زیادہ ہیں اس لئے زیادہ آنے جانے کی وجہ سے گونڈوگورو پاس کی چڑھائی سے پتھر بھی نیچے گرتے ہیں''۔

محبوب کا مقصد ہمیں ڈرانا ہرگز نہیں تھا۔وہ ہمیں پہلے بھی اسی علاقے میں دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ پاکستان کی

سب سے دور اور دشوار وادی تک پہنچنے والے زمینی حقائق سے نظریں نہیں چرا سکتے۔اس لئے وہ ہم سے حقائق کو چھپانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

محبوب کی باتوں نے ہمیں کافی پریشان کیا۔لیکن قبل از وقت ان حقائق کا معلوم ہونا بھی ضروری تھا اور محبوب کی معلومات تازہ ترین تھیں کیونکہ وہ ابھی اسی راستے سے ہو کر آ رہا تھا۔

''محبوب صاحب، معلومات کا بہت بہت شکریہ، ابھی آپ آرام کیجئے اور اس کے بعد ہو سکے تو ہمیں کچھ وقت مزید دیجئے گا'' محبوب کی تھکاوٹ کا احساس کرتے ہی میں نے کہا۔

''جی ضرور! تھکاوٹ تو اتنی جلدی اترنے والی نہیں۔بیس دن سے ہم ان پہاڑوں میں گھوم رہے ہیں۔لیکن میں پورٹروں کی ادائیگی وغیرہ کر لوں تو آپ کے پاس آتا ہوں۔آج ہم نے یہاں رکنا ہے۔میں بھی کچھ گپ شپ کرنا چاہتا ہوں آپ لوگوں سے۔''

محبوب ہاتھ ملا کر پورٹروں کیاس مجمع میں گھس گیا جو اس ایکسپی ڈیشن کا بوجھ یہاں تک لائے تھے۔ایک ڈائری اور قلم پکڑ کر وہ ایک ایک پورٹر کا حساب کتاب کرنے لگا۔بڑی ٹیموں کے ساتھ پورٹروں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہوتی ہے اور مہم کے اختتام پر گائیڈ اور ٹور منیجر کے لئے پورٹروں کو سنبھالنا ایک دشوار کام بن جاتا ہے۔

ریسٹ ڈے کا پیسہ دو، گوشت کا پیسہ دو، وردی دو، خوشی دو۔۔یہ دو۔۔وہ دو۔۔۔

پورٹروں کو مطمئن کرنے کے لئے واقعی بے پناہ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

کچھ دیر پورٹروں کی ادائیگی کا دلچسپ منظر دیکھنے کے بعد میں نے زاہد کو ساتھ لیا اور ریسٹ ہاؤس کے سامنے ایک تاریک سی دوکان میں گھس گیا۔دوکان میں گاؤں کی ضروریات کے مطابق راشن اور روزمرہ کی ضروریات کا سامان تھا۔اس کے ساتھ ساتھ ٹریکنگ وغیرہ سے متعلق بھی کچھ سامان موجود تھا۔کچھ دیر دوکان کے مالک سے گپ شپ کر کے اور سامان کا جائزہ لے کر ہم باہر نکلے اور مشہ بروم کے نظارے کے لئے کھیتوں کی طرف چلے گئے۔

پورٹر نو پرابلم ان ہوشے

ہوشے گاؤں راستے کے ایک طرف آباد ہے۔ دائیں طرف ایک مختصر رقبے پر کھیت ہیں اور اس کے فوراً بعد سنگلاخ پہاڑ ایک دم بلند ہونے لگتے ہیں۔ سامنے کی طرف لہلہاتے کھیتوں کے پار مشہ بروم، گونڈوگورو، چوغولیزا، کے سکس اور کے سیون کی طرف جانے والے راستے ہیں۔ مرکزی راستے کے دونوں طرف چند دوکانیں اور ایک دو ریسٹ ہاؤس ہیں۔ گاؤں کے مکانات راستے کے بائیں طرف ہمارے والے ریسٹ ہاؤس کے پیچھے واقع ہیں۔

گاؤں کی تنگ گلیوں میں جانے اور رہن سہن کے مشاہدے کے لئے خصوصی طور پر ان کچی گلیوں کے اندر جانا پڑتا ہے۔ نیچی چھتوں اور چھوٹے چھوٹے دروازوں والے مٹی سے لیپ ہوئے پتھر اور لکڑی کے مکان سادگی اور بلتستانی انداز کا نمونہ ہیں۔ شدید سردی سے بچاؤ کے لئے ان کی چھتیں خاصی نیچی رکھی جاتی ہیں۔ سرد ہوا سے بچاؤ کے لئے کھڑکیاں اور دروازے بھی ہر ممکن حد تک مختصر رکھے جاتے ہیں۔ غربت سے پر اور آسائشوں سے عاری یہ تاریک مکان ایک دوسرے سے جڑے ہوئے اور چھوٹے ہیں۔ خواتین گھروں کے اندر اور باہر کام کاج میں مصروف نظر آتی ہیں اور میلے لیکن خوبصورت بچے کھیل کود میں۔ گلیوں اور مکانوں کی کچی چھتوں پر چند بکریاں اور بہت سی مرغیاں بھی اچھلتی کودتی نظر آئیں۔ گاؤں کے مکانوں کا سلسلہ زیادہ بڑا نہیں اور 'راستہ تلاش کیجئے' قسم کی ان گلیوں کا سلسلہ جلد ہی ختم ہو جاتا ہے۔

آبادی سے باہر ہر طرف اونچے نیچے زمین کے ٹکڑوں پر کاشتکاری کی جاتی ہے۔ ہوشے کی بلندی کی وجہ سے یہاں پھلوں وغیرہ کی پیداوار نہیں ہو سکتی۔ تیز سرد ہواؤں اور لگ بھگ چھ مہینے برف رہنے کی وجہ سے یہاں درخت بھی کم ہیں۔

میں کھیتوں کے درمیان ایک بڑے یعنی کوئی دس پندرہ فٹ اونچے اور اس سے کہیں زیادہ چوڑے پتھر پر چڑھ

گیا۔ یہ ایک طرح سے چھوٹی موٹی راک کلائمبنگ ہی تھی۔ یہاں میرے بالکل سامنے مشہ بروم کا نظارہ تھا۔ ویسے مشہ بروم کو دیکھنے کے لئے کسی زحمت کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ آسمان کو چھوتی ہوئی یہ چوٹی ہر جگہ سے واضح نظر آتی ہے۔

یہاں بھی دونوں اطراف بھوری اور بلند چٹانوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جبکہ اردگرد گندم کی فصل سرسبز حالت میں لہلہا رہی تھی۔ اطراف کے اکثر پہاڑ زمین سے ایک دیوار کی طرح بلند ہو رہے تھے اور یقیناً ناقابل تسخیر تھے۔ کم از کم اس طرف سے۔

بہت بلندی پر کہیں کہیں سرسبز ڈھلوانیں تھیں جو ان بھورے پہاڑوں کے درمیان دھبوں کی مانند نظر آتی تھیں۔ ہوشے میں کسی نے بتایا تھا کہ اس موسم میں ان ڈھلوانوں میں مارخور، برفانی چیتے اور ریچھ وغیرہ ہوتے ہیں جو برفباری کے بعد گاؤں تک بھی آجاتے ہیں۔ سردیوں میں جب بلندیوں پر برف کے باعث خوراک ناپید ہو جاتی ہے تو یہ جانور کم بلندی کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔

گاؤں کی اس تاریک دوکان میں ہم نے کچھ دیر پہلے ہی ایک تصویر دیکھی تھی جس میں دوکان کا مالک ایک بیل جتنے مارخور کے گلے میں رسی ڈالے نہایت فخر سے کھڑا تھا۔ مارخور کے بڑے بڑے سینگ پیچھے کو مڑے ہوئے تھے اور اتنی بڑی جسامت والے مارخور کو قابو کرنا واقعی ایک مشکل کام نظر آتا تھا۔ یہ مارخور بھی برف اور بھوک کی شدت سے گاؤں میں اترا ہوگا لیکن خود گاؤں والوں کی خوراک بن گیا ہوگا۔ ان علاقوں میں اس طرح کی جنگلی حیات اب بھی موجود ہے لیکن نہایت کم تعداد میں۔ ہم نے رنگ برنگے پرندے تو دیکھے لیکن بڑے جانور جو کسی زمانے میں ان علاقوں میں عام پائے جاتے تھے اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

کافی دیر تک قدرت کے اس انمول علاقے کی رنگینیاں اور حیرتیں دیکھنے اور اللہ کی بنائی اس کائنات کے چند دلفریب نمونوں کے نقوش اپنے دل و دماغ پر ثبت کرنے کے بعد میں اور زاہد واپس ریسٹ ہاؤس میں آگئے۔

غیر ملکی ٹیم کے خیمے قائم ہو چکے تھے اور محبوب اکثر پورٹروں کی ادائیگی سے فارغ ہو چکا تھا اور اس کے اردگرد اب چند ہی لوگ نظر آرہے تھے۔

عظیم مختصر سے جثّے والے ایک بوڑھے کو کوئی لیکچر دے رہا تھا اور یاسر بھی وقتاً فوقتاً لقمے دیتا نظر آرہا تھا۔ ہم جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے اور سمجھنے کی کوشش کی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

معلوم ہوا کہ وہ بوڑھا بضد ہے کہ ہم اسے اپنے ساتھ بحیثیت پورٹر لے کر جائیں اور وہ وزن اٹھا کر دنیا کے مشکل ترین راستوں پر ہمارے ساتھ جائے گا۔اس بزرگ کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہی نظر آتی تھی اور جسمانی طور پر بھی وہ خاصا نحیف تھا۔ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ یہ شخص اس عمر میں ہمارے ساتھ تھوڑا سا بوجھ اٹھا کر بھی چند گھنٹے سے زیادہ نہ چل سکے گا۔اس لئے عظیم اور یاسر مناسب الفاظ میں جان چھڑانے کی کوشش میں تھے۔

یہ وہ غربت تھی جو اس عمر میں بھی اس شخص کو متحرک اور محنت کرنے پر کمر بستہ رکھے ہوئے تھی۔اس سے کہیں زیادہ صحت منداور کم عمر لوگ ہمارے شہروں میں بڑے اعتماد سے بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔لیکن یہ بوڑھا اپنے گھرانے کی کفالت کے لئے اس عمر میں بھی اتنا ہی پر اعتماد تھا جتنا کہ ایک جوان شخص۔ایسے غیور شخص کی مالی امداد کرتے ہوئے بھی ہمیں شرم محسوس ہوئی اور ساتھ لے جانے کا خیال بھی تکلیف دہ معلوم ہوتا تھا۔لہٰذا عظیم نے کسی نا کسی طرح اسے سمجھا بجھا کر بھیج ہی دیا۔

بوڑھے شخص کو رخصت کئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ محبوب بھی آ گیا۔کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ہماری گفتگو کا رخ پھر سے پورٹروں کی طرف ہو گیا۔

''محبوب صاحب،ہمیں پورٹروں کی ضرورت ہے، کیا آپ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کر سکتے ہیں؟'' اچانک عظیم نے پوچھا۔

''آپ لوگوں کو کتنے پورٹر چاہئیں؟ میں نے ابھی پورٹروں کو فارغ کیا ہے ان میں زیادہ تر کا گھر اسکولے اور شگر وغیرہ میں ہے۔میں ان سے پوچھ لیتا ہوں کہ اگر کوئی واپس آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہو تو۔۔''محبوب نے کہا۔

''پورٹر تو جی جتنے کم ہوں اتنا ہی اچھا ہے۔۔ایسے بچے کم ہی اچھے۔۔ادھر سکردو میں تو ان۔۔۔پورٹروں نے ذلیل کر دیا ہمیں۔۔۔''زاہد کو سکردو کا ڈرامہ ذہن میں آتے ہی پھر سے تاؤ آ گیا۔

''تین پورٹر کافی ہوں گے کیونکہ کچھ وزن تو ہم خود ہی اٹھا لیں گے۔اور ہم گوروں کی طرح نہیں بلکہ دوستوں کی طرح سفر کرتے ہیں اس لئے پورٹروں کو ہمارے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''اس موقع پر یاسر نے سمجھداری دکھائی اور زاہد کی بات کاٹ کر کہا۔

''جی میں سمجھتا ہوں۔پورٹر نو پرابلم ان ہوشے۔''

محبوب مسکرایا۔''لیکن جیسا میں نے پہلے کہا تھا کہ اس راستے سے اوپر جانا بہت مشکل ہے اور وزن نہیں اٹھایا

جاتا۔اچھا ہے کہ آپ چار پورٹر لیں تا کہ آسانی رہے۔میں بات کرتا ہوں۔''

محبوب واپس آیا تو اس کے ساتھ تین پورٹر بھی تھے جن کی جلی ہوئی رنگت بتاتی تھی کہ وہ کئی دن سے برفانی وادیوں میں موسموں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

''لیں جی، یہ جوان تیار ہیں۔ان کا گھر شگر میں ہے اور یہ اچھی طرح تمام راستے اور حالات سے واقف ہیں۔میں نے انہیں خاص طور پر ضروری ہدایات دے دی ہیں۔امید ہے کہ اب آپ کو کسی طرح کی بھی پریشانی نہیں ہوگی۔ آپ کے لئے یہ رہنمائی بھی کریں گے اور گپ شپ بھی لگاتے رہیں گے۔''

پورٹروں کے نام ابراہیم،علی اور سلیمان تھے۔ابراہیم چالیس سال کے لگ بھگ اور خاموش طبیعت انسان تھا جبکہ علی اور سلیمان پچیس سال کی عمر کے نظر آتے تھے۔محبوب سے ہم نے درخواست کی تھی کہ پورٹروں سے لمبی تفصیلات کے بجائے ایک متعین معاوضہ طے کریں۔یعنی فی پڑاؤ، آرام کا آدھا معاوضہ اور طرح طرح کی شرائط کے بجائے کل رقم پر معاملہ طے کیا جائے۔محبوب کی مدد سے معاوضے کے معاملات بھی چند منٹوں میں طے ہو گئے۔صبح جلد آنے کا کہہ کر پورٹروں کو رخصت کر دیا گیا۔

محبوب نے سارا مسئلہ ہی حل کر دیا تھا۔

ہنزہ کے اس بے لوث انسان کی سادگی اور خوش اخلاقی نے ہم سب کو شدید متاثر کیا۔بحیثیت گائیڈ اس طرح کے کام اس کے پیشہ ورانہ امور میں شامل تھے۔پروفیشنل سروسز کی بات آئے تو ہم جیسے تو اس میں صرف اپنا فائدہ ہی سوچتے ہیں۔محبوب کم از کم ہم سے بہت مختلف تھا۔ہماری پہلے کوئی جان پہچان نہ تھی۔ہم ایک دوسرے کے نام سے بھی آگاہ نہ تھے۔صرف ہم وطن ہونے کے ناطے وہ ہر طرح سے ہماری سہولت کا خیال رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آج ہمیں دو ایسے انسان ملے تھے جو عام نہیں۔ایک محبوب دوسرا وہ بوڑھا جو زمانے کی سختیوں سے ہار ماننے پر ہرگز تیار نا تھا۔قراقرم کی بلندیوں سے بھی بلند لوگ!

محبوب کے مشورے کے مطابق ہمیں چار پورٹروں کی ضرورت تھی۔تین پورٹروں کا انتظام تو ہو چکا تھا اب ایک ایسے پورٹر کی ضرورت تھی جو کچھ کھانا پکانا بھی جانتا ہو۔

ریسٹ ہاؤس میں ہی ایک لڑکا جس کا نام بھی ابراہیم تھا نے اپنی خدمات پیش کیں۔وہ علی حسن کا بھانجا تھا اور علی حسن کی ہمارے ساتھ جان پہچان کی وجہ سے بخوشی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھا۔ابراہیم کا کہنا تھا کہ وہ کھانا پکانا

جانتا ہے اور کئی ٹیموں کے لئے خدمات انجام دے چکا ہے۔

ہم تو علی حسن سے تعلق کی وجہ سے ہی فوراً رضامند ہو گئے تھے۔لیکن محبوب نے پہلے تو تنقیدی انداز میں اس کا جائزہ لیا اور پھر اپنے انداز میں ایک مفصل انٹرویو کے بعد ہماری مہم کے لئے اسے پاس کیا۔اب چونکہ ہمارے ساتھ ابراہیم نام کے دو پورٹر ہو گئے تھے اس لئے اس موقع پر عمر کی مناسبت سے بڑے ابراہیم کو ابراہیم سینئیر اور دوسرے کو ابراہیم جونئیر کے نام الاٹ کر دیئے گئے۔

ایک بہت بڑا مسئلہ جس نے سکردو میں ہمیں زچ کر کے رکھ دیا تھا یہاں ہوشے میں بغیر کسی دقت کے حل ہو گیا۔آدھے گھنٹے کے اندر اندر چار دوست قسم کے پورٹر فضول بحث ومباحثے کے بغیر مناسب معاوضے پر دستیاب ہو گئے تھے۔

واقعی پورٹر نو پرابلم ان ہوشے!

دیر تک گپ شپ اور محبوب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ہم نے شب بسری کی تیاری شروع کر دی۔اب تک ہم نے اپنے سامان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔اب جیکٹ وغیرہ نکال کر پہنیں اور ہوا لگوانے کی غرض سے سلیپنگ بیگ نکال کر گھاس پر پھیلا دیئے۔

شام گزر رہی تھی اور سورج کی الوداعی کرنیں اب مشہ بروم کی چوٹی کو سرخ رنگ دے رہی تھیں۔ہوشے کی خاموشی گہری اور فضا خاصی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔دور سے آتی دریائے ہوشے کے تیز پانیوں کی آواز اس خاموشی میں سنائی دیتی تھی۔اردگرد کی کیمپنگ سائیٹس میں دن بھر کے تھکے مسافر خیموں اور کرسیوں پر آرام کرنے اور چائے وغیرہ پینے میں مصروف تھے۔

ہم سب دوستوں کے اعصاب پر ٹریک کی وہ مشکلات سوار تھیں جو ہمیں آج معلوم ہوئی تھیں۔اگرچہ ہم خاصے پرامید تھے لیکن جو حالات ہمیں بتائے گئے تھے وہ ہمارے لئے ان دیکھے تھے۔ہمارے لئے جو بات بالکل نئی تھی وہ یہ کہ برف پوش درہ گونڈوگورو کو عبور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ رات کے وقت سفر کیا جائے۔یعنی رات بارہ بجے کے بعد!

وجہ وہی تھی کہ دن کے وقت سفید برف دھوپ کی حدت سے نرم ہو جاتی ہے۔اس نرمی میں انسان کئی کئی فٹ برف میں دھنستا ہے اور چلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔نرم اور پگھلتی اس برف پھر پھسلن بھی انتہا کی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ چھپی

برفانی کھائیوں میں گرنے کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے۔

ایک اور خطرہ جو ان علاقوں میں کسی بھی انسان کو ہو سکتا ہے وہ بلندی کے اثرات ہیں۔یہ اثرات میں بھوک اور پیاس میں کمی،شدید سر درد اور الٹیوں وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔سر میں مسلسل درد جو آکسیجن کی مسلسل کمی اور جسمانی مشقت کی وجہ سے ہوتا ہے سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔تین ہزار میٹر سے زیادہ کی بلندی پر ظاہر ہونے والے یہ اثرات جان لیوا بھی ہو سکتے ہیں۔

خیر اب یہ وقت مشکلات سے ڈرنے کا تو نہیں تھا۔ان سے مقابلے کا خیال ہی ہم سب کے ذہنوں پر سوار تھا اور سب اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ سوچ رہے تھے۔سب ہی کھوئے کھوئے سے تھے۔

رات کا کھانا ہم نے ریسٹ ہاؤس کے ہال نما ڈائننگ روم میں کھایا۔زاہد نے مشورہ دیا تھا کہ آج اپنے کیمپ لگانے کے بجائے ریسٹ ہاؤس کے اس ہال میں ہی رات بسر کر لی جائے۔یہ نہایت معقول بات تھی۔صبح صبح کیمپ اور سامان پیک کرنے میں وقت لگنا تھا اور بہتر تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو ٹریکنگ کا آغاز کر دیا جائے۔

ہال کے فرش پر میٹ بچھانے میں کوئی دیر نا لگی اور سلیپنگ بیگ کھول کر سب سونے کی کوشش کرنے لگے۔

سوچوں کے انبار نے کافی دیر سونے نہ دیا لیکن تھکاوٹ اور سلیپنگ بیگ کی گرمی میں کسی وقت نیند آ ہی گئی۔

ہوشے کا دیو اور اندھیری رات

ریسٹ ہاؤس کے ملازم کی آواز پر آنکھ کھلی۔

''صاحب اٹھو، باہر پورٹر آیا ہے اور بولتا ہے کہ سب صاحب کو اٹھاؤ''

'سب صاحب' تو ظاہر ہے ہم میں کوئی نہیں تھا لیکن پھر بھی سب نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

اپنے سلیپنگ بیگ سے باہر نکلا تو اچھی خاصی ٹھنڈک تھی اور ہال کی کھڑکی سے نظر آتے پہاڑوں پر سردیوں کی صبح کی سفید دھوپ آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ سرد لیکن بہت ہی روشن ہوشے کی وادی ایک تروتازہ اور پرفضا جنت کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ایک یادگار سفر کے آغاز کے لئے یہ ایک بہترین صبح تھی۔

سات بجے ہمارا ناشتہ تیار تھا۔ ناشتے کے دوران کسی کے کہے بغیر پورٹر ہمارا شب بسری کا سامان سمیٹنا اور باندھنا شروع ہو گئے تھے۔ خود ہی سامان کا وزن کر کے پچیس کلوگرام کے حساب سے چاروں پورٹروں نے اپنا اپنا سامان الگ بھی کر لیا۔ محبوب کی ہدایات بہت ہی مکمل تھیں!

محبوب سے ملاقات کی خواہش ہوئی لیکن پتہ چلا کہ وہ کچھ ہی دیر پہلے ایک جیپ پر اپنے غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ کاندے روانہ ہو چکا ہے۔

ریسٹ ہاؤس میں موجود حضرات سے ہاتھ ملانے کے بعد ہم نے پانی کی بوتلیں بھریں اور ریسٹ ہاؤس سے باہر نکل آئے۔ ہوشے کی کچی سڑک پر ہمارے قدموں نے اپنے نشان چھوڑے اور ہم ان کھیتوں کی جانب چلنے لگے جن کے درمیان ایک پگڈنڈی اونچے نیچے کھیتوں کے پیچھے گم ہو رہی تھی۔

اور اس اونچ نیچ سے آگے وہ حیرتیں تھیں جن سے ہم نے آنے والے دنوں میں واقف ہونا تھا!

مشہ بروم صبح کی دھوپ میں نہایت شفاف اور چمکدار نظر آ رہا تھا۔ اس وقت اس پر اڑنے والے بادل بھی نہیں تھے

اور نیلے آسمان کے نیچے یہ فلک بوس چوٹی ایک حسین تصویر کی طرح ساکت نظر آتی تھی۔

گاؤں کے مکانوں کا سلسلہ ختم ہونے ہی کو تھا کہ چند آوازوں نے ہمیں چونکا دیا۔

بائیں طرف ایک احاطے کے اندر سے چند آدمیوں کے جھگڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پہلے تو میں نے اسے وہم سمجھا لیکن بڑھتے قدموں کے ساتھ آوازیں بھی واضح ہوتی چلی گئیں۔ زاہد راستے کے بائیں طرف ایک احاطے کے قریب ہوا اور ایک دم بھاگتا ہوا دیوار پر چڑھ گیا۔ مجھے بھی اسی وقت بہت سے ڈنڈے نظر آئے جو اس طرح متحرک تھے جیسے لوگ لڑ رہے ہوں۔ ہم سب آن کی آن میں دیوار سے اندر جھانکنے پر مجبور ہو گئے۔

اتنے میں پیچھے سے پورٹروں کے ہنسنے کی آواز آئی اور بلتی زبان میں انہوں نے ایک دوسرے سے اطمینان سے باتیں شروع کر دیں۔ میں نے غیر یقینی کی سی کیفیت میں پہلے پورٹروں کو دیکھا اور پھر دیوار کے اوپر سے اندر جھانکا جہاں ایک نیا ہی معاملہ تھا۔

ایک بہت بڑے دیگچے کے نیچے آگ جل رہی تھی اور آٹھ دس آدمی لمبی لمبی ڈانگوں سے دیگچے میں پکائی جانے والی کسی چیز کو گھونٹ رہے تھے۔ زور لگا کر گھونٹنے کی وجہ سے ان کے حلق سے عجیب بلند آوازیں نکلتی تھیں جنہیں سن کر ہمیں لڑائی جھگڑے کا گمان ہوا تھا۔ ہم نے نہایت حیرانی سے اس منظر کو دیکھا۔ کسی بھی طرح کے کھانے کو اس طرح اور اتنے بڑے برتن میں پکتے ہم نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ایسا کھانا جسے پکانے کے لئے اتنے لوگ اتنی مشقت کریں۔

''سر فکر نہیں، ادھر گاؤں کا ایک گھر میں فوتگی ہوا ہے۔ یہ اس کا کھانا پکاتا ہے'' ابراہیم جونیئر آگے آیا اور بولا۔

''کیا اس گھر میں کوئی فوت ہوا ہے؟'' میں نے اسی احاطے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے 'ہو۔۔ہا۔۔ہوں' کی آوازیں متواتر بلند ہو رہی تھیں۔

''وہ گھر پیچھے گلی کا اندر ہے۔ ادھر سب لوگ گھر سے اناج لاتا ہے اور ادھر جمع کرتا ہے۔ کوئی گھی دیتا ہے، کوئی گندم، چاول، دال، مکئی اور جو۔ جب سب چیز جمع ہو تو ادھر ملا کر پکاتا ہے۔'' ابراہیم نے دلچسپ بات بتائی۔

یقیناً ان تمام چیزوں کو اکٹھا ملا کر پکانے سے حلیم نما کوئی چیز تیار ہوتی ہو گی۔

ہم نے دوبارہ چلنا شروع کیا اور جلد ہی کھیتوں کے درمیان والی پگڈنڈی پر پہنچ گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ پہلے دن چلنا شاید آسان نہ ہو اور تھکاوٹ بھی زیادہ ہو اس لئے آہستہ آہستہ چال میں روانی پیدا کی جائے۔ اس خیال کے تحت

سب آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

کچھ دیر میں ایک چڑھائی چڑھنے کے بعد ہم گاؤں کی آخری حد پر پہنچ گئے ۔ یہاں پتھروں کی ایک طویل دیوار مویشیوں سے فصل کی حفاظت کے لئے تعمیر کی گئی تھی۔یعنی وہ جانور جو کھیتوں کو نقصان پہنچ سکیں انہیں اس حدود سے باہر رکھا جاتا تھا۔لکڑی کی ایک چھوٹی سی سیڑھی انسانوں کی گاؤں میں آمدورفت کے لئے دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ہم بھی احتیاط سے سیڑھی اتر کر ہم ایک روانی کے ساتھ قطار کی شکل میں چلنے لگے۔

یہاں سے بائیں ہاتھ پر ایک بلند مینار نما چٹان تھی جو چند سو میٹر کے فاصلے پر بہتے دریائے ہوشے کے دوسری طرف تھی۔اس چٹان کو دیکھ کر میں بے اختیار مسکرا دیا اور پچھلے سال کی ایک رات مجھے یاد آ گئی۔اس چٹان کے بارے میں علی حسن نے ہمیں ایک پراسرار کہانی سنائی تھی۔

مشہ بروم بیس کیمپ جاتے ہوئے علی حسن کا کہنا تھا کہ اس پہاڑی پر ایک دیو کا قبضہ ہے اور وہ مختلف طریقوں سے گاؤں کے لوگوں کو تنگ کرتا رہتا ہے۔کسی دور میں یہ دیو گاؤں کی ایک عورت کو بھی اٹھا کر وہاں لے گیا تھا جو پھر واپس نہ آئی۔کہانی خاصی دلچسپ اور سنسنی خیز تھی۔ہم نے اسے مقامی داستانوں میں سے ایک کہانی ہی سمجھا اور مذاق میں طرح طرح کے تبصرے کرتے رہے۔اتفاق سے دو دن بعد بیس کیمپ سے واپسی پر ہمیں کافی رات ہوگئی۔ اور جب ہم اسی پہاڑی کی نیچے سے گزر رہے تھے تو رات کے گھپ اندھیرے، دریا کے شور، اور سیاہ پہاڑوں کے اس سائے میں لاشعوری طور پر ہم سب کے دل میں اس کہانی کی وجہ سے ناقابل بیان خوف موجود تھا۔کوئی بھی آگے ہونے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا اور ایک دوسرے کو پہلے گزرنے کا کہتا تھا۔ہم آیت الکرسی اور قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے بمشکل اس جگہ سے گزر پائے تھے۔یہ ایک نفسیاتی تاثر تھا جو وقتی طور پر ہم سب پر اثر انداز ہوا تھا۔

ہماری آج کی پہلی منزل 'سپچو' تھی جو پورٹروں کے مطابق تین گھنٹے کا فاصلہ تھا۔سامنے پہاڑوں کے تین سلسلے نظر آ رہے تھے جبکہ ہمارے دائیں ہاتھ پر ایک طویل چٹانی دیوار تھی۔یہ چٹانی دیوار ہوشے سے نکلتے ہی شروع ہوگئی تھی اور ہم پر مسلسل سایہ کئے ہوئے تھی۔سامنے کے منظر میں درمیان والا پہاڑی سلسلہ دائیں اور بائیں کے سلسلوں کو الگ کر رہا تھا اور تینوں سلسلوں کے درمیان دو کشادہ راستے نظر آ رہے تھے۔بائیں جانب کا راستہ مشہ بروم بیس کیمپ کا تھا جس کے اوپر سے جھانکتی مشہ بروم پر اب بدلیوں کے ٹکڑے پرواز کرنا شروع ہو چکے تھے۔جبکہ دوسرا راستہ وہ تھا جس کی طرف ہم جا رہے تھے۔

سرو اور جنگلی گلاب نما پھولوں کے ایک جنگل میں تازہ بہتے پانی پر ہم رک گئے۔منہ ہاتھ دھویا، ٹھنڈا پانی پیا اور بوتلوں میں بھرنے کے بعد ہم پھر چل پڑے۔

یہاں سے کچھ آگے دائیں طرف سے آتا ہوا ایک دریا ہمارے بائیں جانب بہتے دریائے ہوشے میں شامل ہو رہا تھا۔مشہ بروم اور اس کی طرف جانے والا راستہ اب سامنے والے پہاڑی سلسلے کے پیچھے غائب ہو چکے تھے اور ہمارا راستہ بھی اب دائیں جانب مڑتا جا رہا تھا۔سورج جو اب تک چٹانی دیوار کے پیچھے چھپا ہوا تھا اب بلند ہو رہا تھا اور مسلسل چلتے رہنے کی وجہ سے کچھ گرمی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

کچھ دیر چلنے کے بعد میں ایک پتھر پر سانس لینے کے لئے بیٹھ گیا۔مجھے احساس ہوا کہ میرا سر کچھ بھاری ہو رہا ہے۔کچھ دیر آرام کے بعد بھی جب یہ بھاری پن دور نہ ہوا تو میں نے خیال کیا کہ شاید سورج کی تپش کا اثر ہے۔میں اٹھا سر پر ٹوپی کو سیدھا کیا اور چلنے لگا۔اب جوں جوں آگے بڑھا سر کا درد بھی تیز ہوتا گیا۔کوئی نصف گھنٹے بعد میں دائیں طرف سے آنے والے دریا کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔یہاں سے سامنے ایک سیاہ رنگ کے گلیشیئر کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

دائیں طرف دیکھا تو دریا کے راستے کے اوپر بھی پتھروں کی ایک لمبی ڈھلوان نظر آئی جو کسی گلیشیئر کے اختتام کی نشانی تھی۔یعنی اب سامنے وہ گلیشیئر تھا جس کا نام گونڈوگورو ہے اور جس پر چلتے ہوئے ہم نے درہ گونڈوگورو پر چڑھنا تھا۔دائیں ہاتھ پر نظر نہ آنے والے گلیشیئر کے بارے میں میرا خیال تھا کہ یہ 'چرکسا' گلیشیئر ہوگا جو کے سیون اور کے سکس پہاڑوں کے دامن سے اترتا ہے۔

خیر ابھی تو پہلا پڑاؤ بھی نہیں آیا تھا لہٰذا آہستہ آہستہ چلتا رہا۔سر میں درد کی وجہ سے اب چلنا مشکل ہو رہا تھا اور لگ بھگ دو گھنٹے چل کر تھکاوٹ بھی ہو چکی تھی۔چند منٹ چلنے کے بعد ایک تیز رفتار نالہ سامنے آ گیا۔یہ نالا کسی نہ نظر آنے والی چوٹی کی برفوں کا پانی لیئے آ رہا تھا جس پر ایک چوبی پل بھی موجود تھا۔پل پر سے گزرتے ہوئے جو ٹھنڈی ہوا اور شور محسوس ہوا اس نے ایک دفعہ تو جھنجھوڑ ہی ڈالا۔

میں پل پر ہی کھڑا ہو گیا۔مڑ کر پیچھے دیکھا تو دور دور تک کسی ممبر یا پورٹر کے آثار نظر نہ آئے۔دس پندرہ منٹ تک میں نالے کے صاف شفاف پانی پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔پھر مڑ کر دیکھا تو زاہد دور سے آتا نظر آیا۔جلد ہی باقی ٹیم بھی نمودار ہوئی اور ہمارا فاصلہ کم ہونے لگا۔میں پل سے اترا اور چلنا شروع کر دیا۔

یہاں پھر سرونما اور جنگلی پھولوں کے درخت شروع ہو گئے۔ پانی کا شور آہستہ آہستہ بلند ہونا شروع ہوا اور دائیں ہاتھ کے کسی بڑے گلیشیر سے نکلنے والے ریتلے پانی کا ایک دریا سامنے آ گیا۔ دریا پر ایک پل یہاں سے نظر آ رہا تھا جو لکڑی کا ہی تھا اور دریا کے دوسری طرف ایک مکان یا شاید دو کان کے آثار بھی نظر آ رہے تھے۔ قریب پہنچے پر واضح ہوا کہ کچی عمارت کے باہر کچھ بنچ بھی موجود ہیں جس پر اکا دکا لوگ بیٹھے ہیں۔

اس ویرانے میں عمارت، بنچ اور لوگ!

یہ 'سچو' ہی ہو سکتا تھا۔ سرونما پودوں سے گزرتا ہوا میں جلد ہی راستے کی اس سرائے پر پہنچ گیا۔ رک سیک اتارا، ایک بنچ پر بیٹھا اور ٹیم کا انتظار کرنے لگا۔ جلد ہی تمام ٹیم اکٹھی ہو گئی۔

''سر، ابھی کچھ کھائے گا؟'' ابراہیم جونیئر جس کے ذمے کھانے کی ذمہ داری بھی تھی، سامان رکھ کر ہمارے پاس آ گیا۔

''ہاں یار، لیکن وہ پکانا جو فوراً تیار ہو جائے۔ ہم نے ابھی آگے بھی جانا ہے۔''

پلان کے مطابق ہمارا ارادہ تھا کہ روز دو پڑاؤ طے کریں گے تا کہ جلد از جلد ٹریک مکمل کیا جا سکے۔ اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ابراہیم سے کہا۔ ابراہیم سر ہلاتا ہوا سامان کی طرف چل پڑا اور ہم نے آپس میں گپ شپ شروع کر دی۔ زیادہ دیر آرام نہ کرنے کی وجہ سے ہم نے پہلا پڑاؤ توقع سے کم وقت میں کر لیا تھا۔

''یار کوئی ایک گھنٹے سے میرے سر میں درد ہو رہا ہے، شاید دھوپ کی وجہ سے ہے۔'' میں نے ساتھیوں کو بتایا۔

''آہو یار، مینوں وی ہو رہا اے، ایدی کی وجہ اے؟''۔ (ہاں یار، مجھے بھی ہو رہا ہے اس کی کیا وجہ ہے) زاہد نے بھی انکشاف کیا۔

''ہو سکتا ہے ہم پہلے سائے میں چلتے رہے ہیں اور پھر دھوپ کی تپش سے ایسا ہو رہا ہو۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں'' یاسر نے کہا اور عظیم نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

''خیر ابھی کافی وقت ہے ہم آرام کرتے ہیں کھانا وانا کھا کر فرق پڑے گا''۔ عظیم نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

''چلو پورٹرز کے پاس چلتے ہیں، دیکھیں کیا پک رہا ہے''۔ یاسر نے کہا اور ہم سب اٹھ کر اس درخت کی طرف چل پڑے جس کے نیچے ابراہیم نے مٹی کے تیل کا چولہا جلا رکھا تھا۔

باقی تینوں پورٹر بھی وہیں تھے اور سلیمان ایک دیگچی میں سے پانی لا رہا تھا۔ ابراہیم نے ایک برتن میں چاول اور دوسرے میں کوئی دال بھگو رکھی تھی اور چولہے پر چڑھانے کی تیاری کر رہا تھا۔

درخت کے سائے میں لیٹ کر مجھے کافی آرام محسوس ہوا۔ زاہد بھی منہ پر ایک رومال ڈالے لیٹا پڑا تھا۔

کچھ آگے ایک سیدھی چڑھائی تھی جس پر شاید ابھی ہم نے جانا تھا۔ لیکن ابھی اوپر سے ایک ٹریکر نیچے اترتا دکھائی دے رہا تھا۔ چند منٹوں میں وہ ہمارے قریب پہنچ چکا تھا۔ ''ہیلو'' ایک مسکراہٹ کے ساتھ اور ہاتھ ہلا کر ہمارے قریب سے گزرتا ہوا وہ سرائے کے ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

سرائے کے ایک طرف ہموار سطح پر ایک کیمپ لگا ہوا تھا جس میں خاموشی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اندر ابھی کوئی نہیں ہے۔ لیکن کچھ دیر بعد کیمپ کی زپ کھلی اور شرعی داڑھی والے ایک صاحب نمودار ہوئے۔

''اوئے، اے مولوی تے اپنا لگدا جے'' (اوے یہ مولوی صاحب تو اپنے ہی معلوم ہوتے ہیں) زاہد ایک دم چونکا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اتنے میں ایک اور نوجوان بھی کیمپ سے باہر نکل آیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ہماری طرف متوجہ ہوتے ہی وہ دونوں حضرات ہماری طرف آئے۔

''اسلام علیکم، آپ لاہور سے آئے ہیں؟'' داڑھی والے صاحب نے مسکرا کر پوچھا اور ہم سب سے ہاتھ ملایا۔

''نہیں جی، میں اوکاڑے کا ہوں اور یہ تینوں پنڈی اور اسلام آباد کے ہیں'' زاہد نے جواب دیا۔

''اچھا اچھا، کس طرف جا رہے ہیں آپ؟'' اب دوسرے صاحب نے سوال کیا۔

''کنکورڈیا، کیا آپ لاہور کے ہیں؟'' یاسر نے پوچھ ہی لیا۔

''جی ہم لاہور سے آئے ہیں اور ایک بینک میں کام کرتے ہیں۔ کے سیون بیس کیمپ کی طرف جا رہے تھے اس لئے کل سے یہاں رکے ہوئے ہیں۔'' مولوی صاحب نے بتایا۔

کچھ ہی دیر میں ہم بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ لاہور سے آنے والے یہ پانچ لوگ ہیں جو شاید کل واپس چلے جائیں گے۔

ان ٹیم ممبران کے درمیان کسی بات پر اختلاف ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اپنی مہم کو ادھورا چھوڑ کر انہوں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہمیں یہ بات کچھ مناسب معلوم نہ ہوئی لیکن ان کے معاملات میں دخل اندازی کرنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔

''آئیں ادھر کیمپ کے پاس بیٹھتے ہیں۔'' کافی دیر کھڑے کھڑے باتیں کرنے کے بعد ایک صاحب کو خیال آیا اور ہم ان کے کیمپ کے باہر پڑی کرسیوں کی طرف بڑھ گئے۔

عظیم کو اس گورے کے بارے میں تجسس تھا جو اکیلا چڑھائی سے اترا تھا اور بنچ پر بیٹھا ہماری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ گورے کے پاس پہنچ کر عظیم نے ہاتھ ملایا اور باتیں کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں اٹھ کر ہمارے پاس ہی آ گئے۔ عظیم نے اس کا ہم سے تعارف کرایا۔

''یہ مسٹر جانسن ہیں اور انگلینڈ سے آئے ہیں۔ ان کی ٹیم ابھی پیچھے ہے اور شائد ابھی پہنچنے ہی والی ہو۔''

جانسن نے ایک مرتبہ پھر مسکرا کر ہم سب کی طرف دیکھا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''مسٹر جانسن، کیا آپ گونڈوگورو پاس سے ہو کر آ رہے ہیں؟'' ایک خیال آتے ہی میں نے سوال کیا۔

''یس، آف کورس۔'' جانسن ایک مرتبہ پھر مسکرایا۔ وہ ایک خوش مزاج اور بے تکلف انسان معلوم ہوتا تھا۔

''لیکن کیا یہ اتنا کم فاصلہ ہے کہ آپ گونڈوگورو کی دوسری طرف سے درے کو پار کر کے یہاں تک پہنچ بھی گئے ہیں؟'' میرا خیال میری زبان پر آ ہی گیا۔

''نہیں نہیں، شاید یہ ایسا نہیں ہے۔ اصل میں رات کو علی کیمپ سے چلنے کے بعد ہم علی الصبح گونڈوگورو پاس پر چڑھ چکے تھے۔ میں نے کچھ تصاویر بنائیں اور اس طرف اتر کر ہسپنگ تک آ گیا۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میرے پاس اس کیمرے کے علاوہ کوئی سامان نہیں۔ میرا پورٹر اور باقی ٹیم ابھی شاید ہسپنگ میں ہوں یا کہیں راستے میں، لیکن مجھے زیادہ تھکاوٹ محسوس نہیں ہوئی اس لئے میں نے چلتے رہنے کو ہی ترجیح دی۔'' جانسن نے میری بات کو سمجھتے ہوئے تفصیلی جواب دیا۔

''مجھے اعتراف ہے کہ آپ خاصے باہمت ہیں! آپ انگلینڈ میں کیا کرتے ہیں؟''

''تعریف کا شکریہ! میں ایک ڈاکٹر ہوں۔'' جانسن نے جواب دیا۔

جانسن پہلی مرتبہ پاکستان کے ان علاقوں میں آیا تھا اور حیرت اور بے یقینی کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا سکون بھی محسوس ہوتا تھا۔ اسکولے سے مسلسل کئی دن کے سفر کے بعد آج وہ سچو کے اس بے آباد پڑاؤ تک پہنچا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا بھر میں اتنی بلند چوٹیوں اور عجائبات سے لبریز علاقہ وہ کبھی نہیں دیکھ پائے گا۔

''مسٹر جانسن، ممکن ہے کہ آج کی شام ان پہاڑوں میں آپ کی آخری شام ہو۔ کل آپ ہوشے اور پھر سکردو سے

ہوتے ہوئے اپنے گھر لوٹ جائیں گے۔ کیا اس کے بعد آپ قدرت کو اتنے اصلی رنگوں میں کہیں دیکھ سکیں گے؟''

جانسن کے چہرے کی ہمہ وقت مسکراہٹ یکدم معدوم ہوئی اور اس کی جگہ افسردگی نے لے لی۔

''گزشتہ کئی دن سے میں نے اپنے آپ کو اس ماحول اور مناظر سے اس قدر ہم آہنگ کر لیا تھا کہ کوئی اور خیال قریب بھی نہیں آیا۔ ہاں، شاید ان پہاڑوں میں یہ میری آخری شام ہو لیکن یہ دن میں کبھی بھلا نہ سکوں گا۔''

جانسن کی آواز جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی اور اس کی نگاہیں اس آبشار پر تھیں جو سامنے کی ایک بلند پتھریلی چوٹی سے کئی سو میٹر نیچے گر رہی تھی اور اس کی پھوار سے سنہری چٹان کا ایک بڑا حصہ بھیگ کر دھوپ میں چمک رہا تھا۔

پانی میں بہتے پتھر

ایک گھنٹے سے زیادہ آرام اور کھانے نے ہمیں سست کر دیا تھا۔ اور اب ہماری چال میں روانی تھی اور نہ ہی رفتار۔ ہماری سستی کی اس سے بھی اہم وجہ ختم ہونے والی وہ عمودی چڑھائی تھی جو ہم نے سچو سے دیکھی تھی اور اب ہر قدم کے بعد ہمیں کچھ دیر سانس بحال کرنے میں لگ رہی تھی۔ سچو میں آرام سے طبیعت میں جو کچھ بہتری آئی تھی وہ اب رخصت ہو چکی تھی۔ اور جیسے جیسے میں اوپر چڑھ رہا تھا سر کا درد پھر سے شدید ہوتا جا رہا تھا۔

ایک موڑ پر زاہد نظر آیا جو سر جھکائے ایک درخت کے سائے میں بیٹھا تھا۔ میں جان گیا کہ اس کا بھی یہی حال ہے جو میرا ہے۔ اس کے قریب کھڑے ہو کر کچھ ہمت افزائی کی باتیں کرنے کے بعد ہم دونوں نے آہستہ آہستہ چڑھنا شروع کیا۔ میں بہت دیر سے اپنی اور زاہد کے درد کا ہی سوچ رہا تھا۔ اکثر ایسا محسوس ہوتا کہ سوچ کسی ایک نقطے پر ٹھہرتی ہی نہیں ہے۔ کسی بھی سوچ میں انہماک قائم نہیں ہو پا رہا تھا۔ اپنے آپ کو کسی خوش فہمی میں مبتلا کرنے کے بجائے میں نے بلندی کے اثرات کے بارے میں سوچنا چاہا۔

میری چھٹی حس مجھے احساس دلا رہی تھی کہ یہ معاملہ شاید اتنا سیدھا نہیں جتنا میں اور باقی ٹیم ممبران سوچ رہے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو یہ ایک خطرناک بات تھی۔ باقی تمام لوگ ہم سے آگے جا چکے تھے اور کسی سے بھی بات کرنے کا موقع نہ تھا۔ زاہد تھوڑے سے وقفے سے میرے پیچھے آ رہا تھا لیکن فی الحال اسے کسی وہم میں مبتلا کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ اگلے پڑاؤ پر ٹیم ممبران سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کیا جانا چاہئے۔

اب شام کا وقت ہونے والا تھا اور دوپہر کے بعد وقفے وقفے سے غیر ملکی ٹیمیں اپنے پورٹروں کے ساتھ اوپر سے اترتی آ رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے چڑھائی ختم ہوئی۔

ہمارے دائیں جانب اب ایک نیا پہاڑی سلسلہ شروع ہو رہا تھا جس پر کہیں سبزہ تھا اور کہیں یہ خشک پتھروں پر

مشتمل تھا۔ بائیں جانب بظاہر پتھروں، لکڑیوں اور مٹی کے ایک جناتی ڈھیر کو ہم نے پہلی مرتبہ دیکھا۔ یہ گونڈوگورو گلیشیئر تھا جو اس چڑھائی کے ساتھ ساتھ گہرائی میں تھا اور چلتے ہوئے نظر نہیں آتا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ چٹان جس سے کبھی نہ بھولنے والی آبشار گر رہی تھی اب بھی نظر آ رہی تھی لیکن اب ہم بھی اتنی بلندی پر آ چکے تھے جہاں سے اس چٹان کے اوپر جمی برف اور اس سے نکلنے والی یہ آبشار تقریباً ہمارے برابر ہو چکی تھیں۔ سچو کی کیمپ سائٹ اور سرائے اب گہرائی میں کسی موڑ کے پیچھے غائب ہو چکے تھے۔

ایک نسبتاً ہموار میدان سے گزرنے کے بعد ایک ٹیلے کے سرے پر پہنچتے ہی پانی کا شور سنائی دینے لگا۔ کچھ میٹر نیچے تیز رفتار مٹیالا پانی بلکہ کیچڑ کسی آتش فشاں سے نکلنے والے لاوے کی طرح بہہ رہا تھا۔

پانی کے پاس یاسر، عظیم اور چاروں پورٹر پار جانے کا راستہ دریافت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم بھی ان کے قریب پہنچ گئے۔

''کیا بات ہے؟ آگے کیوں نہیں جا رہے؟'' میں نے تقریباً چیخ کر ابراہیم سینئیر سے پوچھا۔ پانی کا شور اتنا تھا کہ بہت قریب سے چیخنے پر بھی بات صاف سمجھ نہیں آتی تھی۔

''اوپر کوئی لینڈ سلائیڈ ہوا ہے اور پانی میں پتھر آتا ہے'' ابراہیم نے بھی میرے کان میں چیختے ہوئے جواب دیا۔

''کیا؟ پتھر پانی میں آ رہے ہیں؟''

میں نے اب اس لاوا نما بہتے کیچڑ کو غور سے دیکھا۔ پانی کے زور کا سنا تو بہت تھا لیکن یہ ماجرا آج ہی دیکھا کہ دس دس کلو وزنی پتھر بھی اس ریلے میں بہتے چلے آ رہے ہیں جن کے مسلسل ٹکراؤ کی وجہ سے پانی کی آواز خوفناک حد تک زیادہ ہے۔

اب کسی کو بھی نالا پار کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ سب کو ڈر تھا کہ ایک آدھ پتھر بھی ٹخنے پر آ لگا تو بس۔۔۔

ہم سب ایک طرف بیٹھ گئے اور کوئی حل سوچنا شروع کیا۔ پانی گہرا نہ تھا، ایک سے دو فٹ تک کی گہرائی ہو گی۔ نالے کی چوڑائی بھی پندرہ بیس فٹ سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن تیز رفتار اتنا تھا کہ اس میں توازن قائم کرنا قریباً ناممکن تھا۔

بالآخر سلیمان اور علی اٹھے اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ڈنڈوں کے سہارے نالے کے وسط تک پہنچ گئے۔ پھر سلیمان تو وہیں اپنا توازن قائم کرنے کی کوشش کرتا رہا جب کہ علی نے دو تین جستیں لگائیں اور دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ اب سلیمان نے اپنا پورٹروں والا لمبا ڈنڈا آگے بڑھایا اور چند قدم پانی میں رکھنے کے بعد ابراہیم جونیئر اور

سینیئر بھی پار ہو گئے۔اس کے بعد یاسر اور پھر عظیم نے ہمت دکھائی اور جوتوں میں کیچڑ بھر کے کسی نا کسی طرح دوسری طرف پہنچ ہی گئے۔

اب میں اور زاہد اس طرف تھے اور زاہد خوفزدہ نظروں سے پانی کو گھورے جا رہا تھا۔اسے اپنی وزنی جسامت کے ساتھ توازن قائم رکھنے کا شاید یقین نہیں تھا۔اسے کشمکش میں دیکھ کر میں نے پانی سے ابھرے ہوئے پتھروں پر پیر رکھا اور دیکھ دیکھ کر کافی دیر میں یہ مہم بھی سر کر ہی لی۔

زاہد کے پاس اب کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بھی ہمت دکھائے اور ہمارے ساتھ آ ملے۔ڈگمگاتا، جھکتا ٹٹولتا وہ نالے کے درمیان تک آ ہی گیا۔ایک ابھری جگہ کو پتھر سمجھ کو اس نے اس پر پیر رکھا لیکن بدقسمتی سے وہ پتھر نہیں تھا۔۔۔کمال اس نے یہ دکھایا کہ مکمل طور پر گرنے سے خود کو اور رک سیک کو بچا لیا لیکن کپڑوں پر اس کے وہ پھول بنے کہ ہماری ہنسی تھمنے کا نام نہیں لیتی تھی۔

کچھ دیر بعد ایسے ہی ایک اور نالے سے واسطہ پڑا لیکن اس کے درمیان ایک دو بڑے پتھروں نے گزرنے کا موقع فراہم کیا اور ہم نسبتاً آسانی سے پار کر گئے۔

یہاں سے آگے ایک میدان تھا جس میں کسی بلندی سے پانی آ رہا تھا اور ایک وسیع علاقے میں پھیل رہا تھا۔یہاں سے بھی آہستہ آہستہ گزرتے ہوئے ہم ایک پہاڑی کی سمت چلتے رہے۔مغرب کا وقت ہوا ہی چاہتا تھا کہ کچھ دور چند بڑے بڑے پتھروں کے درمیان ایک دو کمرے سے نظر آئے۔ادھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ ہمارا دوسرا پڑاؤ ہے جسے گونڈوگورو کیمپ کہا جاتا ہے۔

ہم اب جس بلندی پر آ چکے تھے یہاں اطراف میں ہر طرف برف پوش چوٹیاں گہرے اور ہلکے بھورے پہاڑوں کے پیچھے سے سر نکال رہی تھیں۔ہمارے دائیں طرف جو پہاڑ تھے ان کی ڈھلوانوں پر تازہ گھاس اور چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پھول جبکہ بائیں ہاتھ پر گلیشیر کی دوسری طرف والی چٹانیں خشک اور پتھریلی تھیں۔قدرت کے یہ رنگ اور امتزاج اس قدر واضح تھے کہ اس کے لئے کسی خاص مشاہدے کی ضرورت نہیں۔

گونڈوگورو گلیشیئر کے کنارے اس میدان میں یہ کیمپ سائٹ ویران تھی اور ہمارے علاوہ کسی بھی ذی روح کا نام و نشان نظر نہ آتا تھا۔پتھروں اور درختوں کی ٹہنیوں سے تیار کردہ چھوٹے چھوٹے یہ دو کمرے پورٹروں نے اپنے آرام کے لئے بنا رکھے تھے۔پورٹر پہلے ہی سامان وغیرہ رکھ کر آرام کر رہے تھے۔پہنچتے ہی ہم بھی باری باری ڈھیر ہوتے

گئے۔

''یار سلیمان کیمپ لگا لو، پھر اندھیرا ہو جائے گا۔''میں نے اندھیرا ہوتے دیکھ کر کہا۔

سلیمان کے ساتھ یاسر نے بھی مدد کی اور فوراً کیمپ لگا دیا گیا۔کیمپ کے لگتے ہی زاہد سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔

ابراہیم جونیئر جلدی جلدی سامان کھول کر کھانے پینے کے بندوبست کی فکر میں تھا۔خوراک کے بیگ سے اس نے ٹن فوڈ، آٹا اور برتن وغیرہ نکالے اور چولہا جلانے لگا۔

کھانا کھانے کا دل نہیں کر رہا تھا۔ہم نے خشک خوراک کے ڈبے لیتے ہوئے سب کی پسند کا پورا خیال رکھا تھا۔اور مجھے یقین ہے کہ عام حالات میں یہ کھانا بہت رغبت سے کھایا جاتا۔لیکن شاید یہ تھکاوٹ تھی یا بلندی جو دل سے کھانے کی رغبت کو نکال لے گئی تھی۔

زاہد کو بھی بڑی مشکل سے باہر بلایا گیا۔وہ اپنا مخصوص رومال سر پر لپیٹے ہوئے تھا۔یہ رومال اتنا بڑا تھا کہ تین چار لوگوں کے لئے دسترخوان کا کام بھی دے سکتا تھا۔

چندنوالے کھا کر میں نے ابراہیم کو ایک گلاس دودھ تیار کرنے کا کہا۔ہمارے پاس خشک دودھ کی بھی خاصی مقدار موجود تھی جو ہم نے اسی سوچ کے تحت ضرورت سے زائد خریدا تھا۔

''زاہد کی طبیعت کافی خراب لگ رہی ہے۔''یاسر نے ایک پتھر سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''دوپہر تک تو میں بھی اسے دھوپ وغیرہ کا اثر ہی سمجھ رہا تھا۔لیکن مجھے خدشہ ہے کہ یہ بلندی کے وہ اثرات ہیں جن کے بارے میں ہم نے سن اور پڑھ رکھا ہے۔''میں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

''جی ہاں اطہر صاحب، ہمیں اس معاملے کو لاپرواہی سے نہیں ہینڈل کرنا چاہئے۔''عظیم نے بھی مجھ سے اتفاق کیا۔

''آج ہم لوگوں نے اچھی خاصی بلندی طے کی ہے۔ابھی ہمارے جسم اس بلندی کے عادی نہیں ہیں۔''

''پہلے ہی دن میں اتنی بلندی کی توقع نہیں کر رہا تھا۔اور وقت بچانے کے لئے ہم فاصلہ بھی زیادہ طے کر رہے ہیں۔آج کی رات بہت اہم ہے۔ہمیں امید کرنی چاہئے کہ رات کو آرام کر کے اور ڈائی ماکس کی گولیاں کھا کر ہم آگے چلنے کے قابل ہو جائیں۔''میں نے امید ظاہر کی۔

بلندی کی مہمات میں اصول ہے کہ ایک دم زیادہ بلندی پر نہیں جایا جاتا بلکہ کچھ بلندی پر جا کر واپس آ جاتے ہیں اور

پھر اگلی دفعہ مزید اوپر جا کر کچھ نیچے اتر آتے ہیں۔اس سے انسان کم آکسیجن اور بلندی سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس وقت کم اور سفر زیادہ تھا۔

''ایسا کرتے ہیں کہ تھکاوٹ کے باوجود کچھ کوشش کر کے ہم سب یہ سامنے والی پہاڑی پر تھوڑا سا چڑھتے ہیں اور پھر واپس آ کر سو جاتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اکلامیٹائزیشن کے لئے یہ طریقہ بہت موثر ہے۔''عظیم نے رائے پیش کی۔

عظیم کی بات بالکل بجا تھی۔ مجھ میں ہمت تو نہیں تھی لیکن یہ مشورہ دل کو لگتا تھا۔ زاہد کو سمجھایا لیکن وہ دوبارہ سلیپنگ بیگ میں گھس چکا تھا اور کسی صورت باہر نکلنے کو تیار نہ تھا۔

گلیشیئر کے کنارے اس کھلے میدان میں ٹھنڈ بھی کافی ہو چکی تھی اور رات تیزی سے اتر رہی تھی۔ گرم پروں والی جیکٹ، سر پر ٹوپی اور گرم دودھ پینے کے بعد میں آہستہ آہستہ دائیں ہاتھ کی پہاڑی پر چڑھنا شروع ہوا۔ یہ گھاس اور خوش رنگ پھولوں سے لبریز ایک آسان ڈھلوان تھی جو کہیں بہت اوپر جا کر دشوار ہوتی گی۔ دھیرے دھیرے چلتا ہوا میں میدان سے سو ڈیڑھ سو میٹر کی بلندی تک آ گیا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں واپس آیا اور ڈائی ماکس کی دو گولیاں کھا کر لیٹ گیا۔

عام حالات میں شاید اس درد کے ساتھ تمام رات نیند نہ آتی لیکن تمام دن کی تھکاوٹ کے بعد جسم کو جیسے ہی گرمی اور آرام میسر آیا، نیند نے تمام حسیات پر قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ بمشکل دس منٹ کے اندر اندر میں گہری نیند سو چکا تھا۔

ریت کی دیوار، دیوار میں پتھر اور نیچے۔۔۔

تمام رات اس قدر گہری نیند سویا کہ صبح جب علی نے کیمپ کے باہر زوردار آوازیں دیں تو ہوش آیا۔

کیمپ کی دیواریں روشن تھیں اور طبیعت میں غایت درجہ سکون تھا۔ کل کے اذیت ناک درد کا شائبہ تک نہیں تھا اور تھکاوٹ بھی دور ہو چکی تھی۔ اٹھا، باہر نکلا اور قریب پڑی ایک بوتل لے کر ضروریات سے فارغ ہونے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں نکل گیا۔ ابھی تک کسی بھی جگہ ہمیں صاف اور تازہ پانی کی کمی نہیں ہوئی تھی۔

واپسی پر سب لوگ چولہے کے اردگرد ایک دائرہ بنائے بیٹھے تھے اور چائے اور پراٹھا نما یا پوری نما کوئی چیز اچار کے ساتھ کھانے میں مشغول تھے۔

سب نے مجھ سے سر کے درد کے بارے میں پوچھا اور میرا جواب سن کے سب کے چہرے کھل اٹھے۔ زاہد نے بھی افاقہ بتایا لیکن شاید وہ ابھی بھی مکمل ٹھیک نہیں تھا۔

''سناؤ جناب، طبیعت کا کیا حال ہے؟ اگر ابھی ٹھیک نہیں ہو تو ہم کچھ دیر مزید انتظار کر لیتے ہیں۔'' ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے زاہد سے پوچھا۔

''کل سے بہت بہتر ہے۔ نیند بھی ٹھیک آئی ہے۔ آگے چلو میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' زاہد نے کہا۔

''یار، یہ کوئی اوکاڑہ نہیں ہے۔ پتہ نہیں آج کیسا راستہ ملے گا۔ صحیح بات بتاؤ ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے۔'' یاسر نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

''گل اوکاڑے دی نئیں۔ میں نے کہا نا کہ اب بہتر ہوں تو بس ٹھیک ہوں۔ بس اب چلو۔'' زاہد کو بھی تاؤ آ گیا۔

ہم سب نے اسے سمجھایا کہ اس حالت میں مزید بلندی کی طرف جانا مناسب نہیں لیکن وہ نہ مانا۔ واپسی یا تاخیر کے بارے میں وہ سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اتنے میں پورٹروں نے اپنا سامان تیار کر لیا اور کیمپ پیک کرنے لگے۔ زاہد نے آگے بڑھ کر اپنا رک سیک اٹھا لیا۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بہتری کی امید کے ساتھ سفر کے لئے

تیار ہو گئے۔

ہماری اگلی منزل 'دلسانپا' تھی جس کے بارے میں اندازہ تھا کہ تین سے چار گھنٹے کا سفر ہوگا۔

''سرا دھر سے پانی لے لو۔ آگے پانی دور ہے''۔ ابراہیم جونیئر اپنا سامان اٹھا کر ہمارے پاس آ گیا۔

ہم نے پانی پیا اور بوتلوں میں بھی بھر لیا۔ ابراہیم کے مطابق آگے صاف پانی اب کافی دیر بعد آنا تھا۔

گونڈوگورو کیمپ میں ابھی ہم میدان کے دائیں کنارے پر تھے۔ اب آہستہ آہستہ بائیں جانب گلیشئر کی طرف چلنا شروع کیا۔ پورٹر ہم سے آگے تھے اور ان کے پیچھے ہم ایک قطار کی صورت میں قدم اٹھاتے جا رہے تھے۔

میدان کا اختتام ایک چھوٹے سے ٹیلے پر ہوا۔ یہاں سے ایک انتہائی تنگ راستہ گلیشئر کی سطح تک نیچے جاتا تھا۔ ڈھلوان اتنی تند اور زمین اتنی بھربھری تھی کے پیر جمانا مشکل تھے۔ دھب دھب کرتے ایک ایک کر کے ہم نیچے اترے۔

اب گلیشئر ہم سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر تھا اور اس سے نکلنے والی ٹھنڈک ہمیں واضح طور پر محسوس کر سکتے تھے۔ انتہائی کٹے پھٹے گلیشئر کے اس حصے کو دیکھ کر ہم سب تھرا گئے۔

اگر کسی مقام پر اس جیسے گلیشئر پر سفر کرنا پڑے تو یہ ناممکن تھا۔ کہیں ایک دم ابھرتی برف کی کئی فٹ اونچی سلیں اور کہیں کنویں جیسا کٹاؤ جس کے اندر پگھلتی برفوں کا پانی جمع ہو رہا تھا۔ کہیں برف نیلگوں سفید اور کہیں کالی ریت میں ڈوبی خوفناک سیاہی۔ گلیشئر کا ایسا خوفناک منظر اس سے پہلے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ کبھی قریب اور کبھی دور سے گلیشئر کے ٹوٹنے کی آوازیں مسلسل تھیں۔

یہ سب دیکھتے اور سنتے ہم اس راستے پر چلتے رہے جو برائے نام ہی راستہ تھا۔

یہاں زمین اتنی بھربھری تھی کہ پاؤں دھنستے تھے۔ کہیں گلیشئر کا پانی زمین کو دلدل بنائے ہوئے تھا اور یہ سب بمشکل ایک فٹ چوڑی پگڈنڈی کا ماجرہ تھا۔ دائیں ہاتھ پر ایک نہایت بلند دیوار تھی جو صرف ریت کی تھی اور صاف نظر آ رہا تھا کہ لینڈ سلائیڈنگ یہاں ہر وقت کا معمول ہے۔

ایک جگہ میں سانس لینے کے لئے رکا اور اوپر دیکھا تو میری سانس اٹک کر ہی رہ گئی۔ میرے سر کے عین اوپر اس کٹی پھٹی ریتلی دیوار میں جگہ جگہ کئی کئی من وزنی پتھر لٹک رہے تھے جو کسی بھی لمحے گر سکتے تھے۔ ریت میں دھنسے ان پتھروں کا کہیں آدھا حصہ ہوا میں تھا اور کہیں اس سے بھی زیادہ۔

میں نے گھبرا کو فوراً چلنا شروع کر دیا۔

اب وقفے وقفے سے میں اوپر دیکھتا اور اس یقینی معلق موت کو دیکھ کر قدم تیز کرنے کی کوشش کرتا۔ تیز رفتاری میں مزاحم بھربھری زمین اور مسلسل دائیں بائیں مڑتی اترائی چڑھائی تھی جس پر عام حالات سے کہیں زیادہ زور صرف ہوتا تھا۔ زور لگانے سے کم آکسیجن کے باعث سانس چڑھ جاتا تھا اور پھر رکنا پڑتا۔

اچانک دو غیر ملکی لڑکے بری طرح ہانپتے ہوئے میرے سامنے آ گئے۔ ابھی تک میرا خیال تھا کہ شاید میں ہی برے حال میں ہوں لیکن ان لڑکوں کو دیکھ کر مجھے اپنے سے زیادہ ان کی حالت پر ترس آیا۔ ان کے چہرے ٹماٹروں کی طرح سرخ اور سانسیں کئی میل پوری رفتار سے دوڑنے والے کسی گھوڑے کی طرح چل رہی تھیں۔

میں نے 'ہیلو' کہا تو ان سے جواب تک نا دیا گیا۔

میں ایک طرف ہو کر دیوار کے بالکل ساتھ چپک گیا تا کہ وہ گزر سکیں۔

چند منٹ سانس لینے کے بعد ان میں سے ایک لڑکا مجھ سے مخاطب ہوا۔

''اگلے پڑاؤ کے لئے ابھی ہمیں کتنا چلنا ہوگا؟''

''تمہاری مشکل کا یہ آخری آدھا گھنٹہ ہے۔ اس کے بعد اگلے نصف گھنٹے میں تم آسانی سے سیچو پہنچ جاؤ گے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تھینک یو فار دس گڈ نیوز'' لڑکے آگے گزرنے لگے۔

''مجھے یہ بتاؤ کہ دلسانپا یہاں سے کتنی دیر کا فاصلہ ہو سکتا ہے؟'' میں نے پیچھے مڑ کر سوال کیا۔

''میرا خیال ہے کہ ابھی تمہاری منزل دور ہے۔ ہم نے بہت تند اترائی پر سفر کیا ہے اس لئے صحیح وقت کا اندازہ ہم شاید نا دے سکیں'' لڑکے نے مڑ کر نسبتاً معذرت خواہانہ لہجے میں بتایا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں۔ بہر حال راستے کے بارے میں پیشگی اطلاع کا شکریہ۔''

میں مڑا اور پھر سے موت کے اس کنویں میں چلنے لگا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ اس خوفناک حصار سے نکلنے میں لگا۔

یہ ایک خاصا لمبا موڑ تھا جس میں ایک گدلے پانی کا نالہ کسی بلندی سے آ رہا تھا اور گلیشئر کو کاٹتا ہوا نجانے کہاں جاتا تھا۔ نالا دائیں جانب سے آ رہا تھا اور اس ریتلی دیوار کو نصف دائرے کی شکل میں کاٹ رہا تھا۔

نالے کے پار ایک سیدھی چڑھائی تھی جس پر دوراٹکا ہوا یاسر نیچے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ آج یاسر کی رفتار ہم سب سے تیز تھی اور وہ آگے تھا۔

نالے میں پڑے بڑے بڑے پتھروں پر چھلانگیں لگاتا ہوا میں پار ہوا اور ایک پتھر پر بیٹھ کر سکون کا زوردار سانس لیا۔

زندگی میں یہ پہلا راستہ تھا جس میں اپنی احتیاط کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ اگر اللہ کی مہربانی نہ ہوتی تو کسی بھی قدم پر اوپر سے لڑھکتی کوئی چٹان یا بھاری پتھر زندگی کا خاتمہ کر سکتا تھا۔

اب یہ چڑھائی بھی طویل ہوتی چلی گئی اور اس گہرے کنویں نما مقام سے جہاں ہم میدان سے نیچے اترے تھے نکلنا ناممکن نظر آنے لگا۔

چلتے، رکتے، پسینہ پونچھتے، نجانے کتنا وقت ہو گیا کہ ایک موڑ کے بعد راستہ کچھ ہموار ہوا اور جان میں جان آئی۔ موڑ مڑنے کے بعد زمین کچھ پھیلنا شروع ہوئی اور کہیں کہیں گھاس بھی نظر آنے لگی۔ قدم اٹھانے میں آسانی ہوئی تو رفتار کچھ تیز ہو گئی اور کچھ ہی دیر کے بعد جب سرسبز گھاس اور پیلے پھولوں سے گھرے ایک چھوٹے سے چشمے سے ٹھنڈا پانی پیا اور منہ ہاتھ دھویا تو سکون سا محسوس ہوا۔

اس جگہ سے آگے پگڈنڈی تک پر گھاس تھی اور اطراف کی سرسبز گھاس آنکھوں کو تراوٹ بخش رہی تھی۔ کچھ آگے جانے پر ایک طرف ابراہیم جونیئر اور یاسر ایک چٹان کے سائے میں گھاس پر بیٹھے نظر آئے۔

''ویلکم ٹو دلسانپا''

مجھے دیکھتے ہی ابراہیم نے زوردار نعرہ لگایا۔

میں ڈولتا ڈولتا ان کے قریب پہنچا اور زمیں بوس ہو گیا۔ گھاس کے مخملی فرش پر لیٹ کر ایک گداز سا محسوس ہوا اور نیند سی آنے لگی۔

''یار میں نے ایک فیصلہ کیا ہے!''

اچانک یاسر نے ڈرامائی انداز میں کہا اور میری بند ہوتی آنکھیں کھل گئیں۔

''وہ کیا؟''

میں ناچاہتے ہوئے بھی اٹھ بیٹھا۔

''آئندہ میں تمہارے ساتھ کبھی نہیں آؤں گا۔ ذلالت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ یہ راستہ کوئی انسانوں کے چلنے کا تھا؟'' یاسر کا روایتی غصہ اپنے عروج پر تھا۔

''میں بھی آئندہ تمہیں ساتھ نہیں لاؤں گا۔ یہ سرسبز میدان اور پھولوں سے بھرا پہاڑ، پیچھے مشہ بروم اور وہ سامنے گھاس میں بنتی چھوٹی سی جھیل جس کے عکس میں برف پوش چوٹیاں اور نیلا آسمان جھلکتا ہے۔ یہ کوئی جگہ تھی آنے کی؟ ایسی کئی جگہیں تو پنڈی میں بھی ہوں گی۔۔۔ ہے نا۔۔ اور تم کار پر بھی وہاں جا سکتے تھے!''

''زاہد اور عظیم نہیں پہنچے ابھی تک۔ یار ابراہیم چائے پلاؤ اور کچھ کھلاؤ میں ذرا آرام کر لوں۔ ابھی آگے بھی جانا ہے۔'' یاسر نے کان کھجاتے ہوئے اس جھیل کی طرف دیکھا جس کی سطح میں کہیں اوپر سے آتا شفاف پانی مسلسل اضافہ کر رہا تھا اور کونیوں کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔

کچھ دیر میں عظیم بھی آ گیا۔

''زاہد بہت آہستہ چل رہا ہے۔ چڑھائی کے درمیان میں ہو گا تھوڑی دیر لگے گی اسے آنے میں۔'' عظیم نے استفسار پر بتایا۔

''تینوں پورٹر کیا پیچھے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں تو، مجھے تو وہ کہیں نظر نہیں آئے'' عظیم نے حیرت سے کہا۔

''وہ تو سب سے آگے تھے اور ابراہیم جونیئر ان تینوں سے پیچھے میرے ساتھ آ رہا تھا۔'' یاسر نے کہا۔

ابراہیم کی طرف دیکھا تو وہ بھی کہیں غائب ہو چکا تھا۔ شاید پانی وغیرہ لینے گیا ہو۔ لیکن پانی تو ہمارے بالکل پاس سے بھی جا رہا تھا۔

ابھی ہم حیران ہی ہو رہے تھے کہ ابراہیم افسردہ اور پریشان سی شکل لئے ایک طرف سے آتا دکھائی دیا۔

''سر بڑا خرابی ہوا'' ابراہیم نے بیٹھی آواز سے کہا۔

''خیریت؟ کیا ہوا؟ وہ تینوں کہاں ہیں؟'' ہر طرف سے سوالات شروع ہو گئے۔

''سر، وہ ادھر سلیمان اور علی کے گاؤں کا ایک پورٹر فوت ہوا ہے۔ اوپر پاس پر اس کا طبیعت خراب ہوا ادھر نیچے وہ بہت مشکل سے آیا پھر گلیشیر پر فوت ہو گیا۔''

ہم سب گم سم اس کی بات سنتے رہے۔

سب کے ذہنوں میں خوف اور بے یقینی کے گہرے بادل چھا گئے۔شگر کا ایک پورٹر جو بلندیوں اور برفوں میں کھیلتے جوان ہوا ہو اور اس راستے پر کئی دفعہ گزر چکا ہو وہ فوت ہو جائے تو ہمارا کیا ہوگا؟

''سر سلیمان اور علی میت کو نیچے گونڈوگورو کیمپ تک چھوڑنے جاتا ہے اور آپ سے پوچھنے کا بولتا ہے۔'' ابراہیم نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جھجکتے ہوئے پوچھا۔

میں نے پریشانی سے سب ممبرز کی طرف دیکھا۔

''جانے دو یار۔ان کے گاؤں کا آدمی ہے کیا پتہ کوئی رشتہ دار ہی ہو۔ایسے موقع پر اپنے لوگ ہی کام آتے ہیں'' یاسر خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔

''ابراہیم، کیا اس پورٹر کی ٹیم میں باقی لوگ نہیں ہیں؟ اور وہ خود اس معاملے کو کیوں نہیں دیکھتے؟''عظیم نے کچھ سوچ کر ابراہیم سے پوچھا۔

''سر، وہ گوروں کا ٹیم کے ساتھ تھا۔گائیڈ نے ایک پورٹر کے ساتھ اسے ہوشے پہنچنے کا بولا اور خود ٹیم کے ساتھ ہسپنگ میں رک گیا۔ٹیم کا بہت سامان ہے اور ابھی کوئی اوپر جائے گا تو بتائے گا۔ابھی ایک پورٹر اسے کیسے لے جائے گا۔ادھر راستہ آپ نے دیکھا ہے۔سلیمان اور علی اس کے ساتھ نہ گیا تو گاؤں کا لوگ ان کو بہت برا بولے گا کہ پیسہ کے لئے یہ لوگ کسی کا مرنے کا فکر بھی نہیں کرتا۔'' ابراہیم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

کچھ شش و پنج کے بعد میں نے ابراہیم سے پوچھا

''لیکن پھر ہمارا کیا ہوگا؟ کیا ہم یہاں آرام ہی کرتے رہیں گے۔''

''سر، میں اور بڑا ابراہیم آپ کے ساتھ جاتا ہے۔ہم بوجھ اٹھائے گا اور علی اور سلیمان تین چار گھنٹے میں واپس آئے گا۔آپ فکر نہ کرو جب یہ بوجھ کے بغیر آئے گا تو جلدی ہم سے مل جائے گا۔'' ابراہیم نے کہا اور بھاگ کر ایک طرف غائب ہو گیا۔

ان علاقوں میں کبھی کبھار سیاحوں اور پورٹروں کے حادثات کا شکار ہونے کا سب کو علم ہے۔اور زیادہ تر یہ حادثات خراب موسم، برفانی کھائیوں اور دشوار راستوں سے گرنے کے باعث پیش آتے ہیں۔ابھی ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ اس پورٹر کی وفات کیسے ہوئی، لیکن ابراہیم کا کہنا تھا کہ وہ بیمار ہوا اور خود ہی نیچے بھی آیا۔۔پھر ایسا کیا ہوا؟

یہ سوال ابھی باقی تھا۔

زاہد بھی پہنچ چکا تھا اور عظیم نے اسے بھی صورتحال سے آگاہ کر دیا تھا۔کچھ دیر بعد دونوں ابراہیم آتے نظر آئے۔ ابراہیم جونیئر نے فوراً برتن نکال کر چائے وغیرہ بنانی شروع کر دی۔دن کا وقت بچانے کے لئے ہم نے صبح ہی کچھ فالتو روٹیاں پکوا کر رکھ لی تھیں۔ٹن فوڈ نکال کر گرم کیا اور کھانا کھایا گیا۔

ایک گھنٹے کے آرام کے بعد ہم نے اگلی منزل کی طرف روانگی کا ارادہ کیا۔ابراہیم سینیئر نے بتایا کہ کچھ سامان علی اور سلیمان ساتھ لے گئے ہیں تاکہ ان دونوں کے لئے ناقابل برداشت بوجھ نہ رہ جائے۔

''سر، اب کافی دیر ہو گیا اور وہ تیز چلتا ہوگا۔ادھر جب ہم گلیشیئر پر جائے گا تو وہ جلدی ہم سے ملے گا۔آپ فکر نا کرو۔'' ابراہیم نے میرے چہرے پر سوچ کے آثار دیکھ کر تسلی دی۔

سلیمان اور علی کا چھوڑا ہوا اضافی سامان ان دونوں نے اپنے سامان کے اوپر باندھ لیا اور ہم رفتہ رفتہ پھیلتی اس نیلی جھیل کے کنارے کنارے اگلی منزل کی طرف چل پڑے۔

گونڈوگورو گلیشیئر

دلسانپا ایک حسین جگہ تھی۔

اگر ہمارے پاس وقت ہوتا تو میں کم از کم ایک رات وہاں ضرور ٹھہرتا۔ یہاں کوئی درخت نا تھا۔ لیکن یہ قراقرم کے ان پوشیدہ مقامات میں سے ایک مقام تھا جس تک پہنچنا ہر کسی کے مقدر میں نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہزار ڈھونڈنے کے باوجود شاید دلسانپا کی ایک تصویر بھی کہیں نہ مل سکے گی۔ انٹرنیٹ کی اس دنیا میں جہاں ذہن کے خیالات بھی دنیا کے ہر انسان تک پہنچائے جا سکتے ہیں، قدرت کے اس خوبصورت ٹکڑے کے بارے میں چند انسانوں کے علاوہ سب بے خبر ہیں۔ چھوٹی سی اس جنت میں فطرتی حسن کے شیدائیوں کے لئے بہت کچھ تھا۔ لیکن وقت کی کمی کے باعث ہم اس جنت میں زیادہ دیر نہ رہ سکے۔

کچھ دور تک سرسبز قالین ہمارے راستے میں بچھا رہا اور پھر پتھروں اور مٹی نے راستے کا رنگ بدل دیا۔ کچھ دیر بعد گول بڑے بڑے پتھروں کے ایک اونچے انبار پر چڑھتے ہوئے ہم ایک تنگ پگڈنڈی پر آ گئے جس کے نیچے گلیشیئر اور گلیشیئر کی دوسری طرف مشہ بروم سلسلے کے سفید کیک کی طرح کے گلیشیئر نظر آ رہے تھے۔

یہاں سے آگے جہاں بھی نظر جاتی تھی سفید برف ہر طرف ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ جس پگڈنڈی پر ہم چل رہے تھے وہ کچھ آگے جا کر ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے ہم نے گلیشیئر پر اترنا تھا اور شاید باقی کا سفر گلیشیئر پر ہی تھا۔

پگڈنڈی نے اچانک دائیں طرف ایک سیدھی ڈھلوان کی شکل میں بل کھایا اور۔۔۔ ہم چھلانگیں لگا کر گلیشیئر پر پڑے ایک بڑے پتھر پر پہنچ گئے۔

گلیشیئر یہاں بڑے بڑے پتھروں سے ڈھکا ہوا تھا اور پتھر برف میں پیوست تھے۔ کچھ پتھر پیر رکھنے پر ہلتے تھے

اور توازن قائم کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ کبھی ہم پتھروں سے اتر کر ٹھوس برف پر آ جاتے اور کسی طویل و عریض پتھر کے راستہ روکنے پر دوبارہ پتھروں پر چھلانگیں لگاتے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے۔

تھوڑی ہی دیر میں ہمارا برا حال ہو گیا۔

سامان اٹھا کر متواتر ایک پتھر سے دوسرے پتھر پر اچھلتے اچھلتے کمر اور کندھوں میں درد ہونے لگا۔

ہم گلیشیئر کے دائیں کنارے پر اترے تھے اور اس کے وسط میں پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گلیشیئر کے درمیان تک پہنچتے پہنچتے ہمیں کافی وقت لگ گیا۔ درمیان میں پہنچ کر پتھر پھلانگنے کا سلسلہ کم ہو گیا لیکن اب گلیشیئر کی دراڑیں راستہ روکنے لگیں۔ کہیں کہیں دراڑوں کے منہ پر کسی بڑے پتھر پر پیر رکھ کر گزرنے سے آسانی ہو جاتی تھی لیکن اکثر دراڑوں کو چھلانگ لگا کر ہی پار کرنا پڑتا تھا۔

یاسر اور عظیم پورٹروں کے پیچھے اور مجھ سے آگے جا رہے تھے۔ زاہد سب سے پیچھے تھا اور اس کی طبیعت ٹھیک ہوتی نظر نہ آ رہی تھی۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ اگر زاہد کی طبیعت مکمل ٹھیک نہیں ہوتی تو اسے کسی نہ کسی طرح واپس بھیجنا پڑے گا۔ زاہد بھی تھوڑی دیر میں لڑکھڑاتا ہوا میرے قریب ایک اور پتھر پر بیٹھ گیا۔

''یہ کیسا گلیشیئر ہے؟ اس کے تو کسی چپے کا فرما بھی سیدھا نہیں۔'' زاہد نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

''میں تو شکر کر رہا ہوں کہ یہ ویسا گلیشیئر نہیں جو گونڈوگورو کیمپ سے نیچے اتر کر سامنے آیا تھا۔۔ وہ تو نری موت تھی'' مجھے صبح کے خیالات یاد آ گئے۔

''او۔۔ اس کا تو نا منہ تھا نا متھا۔۔ یار یہ تصویروں والے گلیشیئر کہاں ہوتے ہیں؟'' زاہد کو کسی ویب سائیٹ یا رسالے کی کوئی تصویر یاد آ گئی جس میں سفید برف کا ایک ہموار میدان نظر آ رہا ہوتا ہے۔

''وہ زیادہ تر سائبیریا اور انٹارکٹکا میں ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ شاید ہمارا اس سے ملتے جلتے کسی گلیشیئر سے واسطہ پڑ ہی جائے۔'' میں نے ہر طرف سفید چوٹیوں کی طرف نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا اور چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

جس پگڈنڈی سے ہم گلیشیئر پر اترے تھے وہ کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ وہاں کوئی آدمی ایک ڈنڈے کو کندھے پر رکھے

دونوں طرف کچھ لٹکائے آتا نظر آ رہا تھا۔ شاید کوئی پورٹر تھا۔ لیکن پورٹر اکیلے تو نہیں ہوتے کوئی ٹیم بھی ہوگی۔ میں نے قدم اٹھایا اور کچھ آگے بڑھا۔

تھکاوٹ اب شدید ہوتی جا رہی تھی۔ میں چند قدم اٹھاتا اور دس منٹ آرام کر کے تین چار منٹ چلتا تھا۔ ایک بڑے پتھر کے پیچھے سے ایک جھکا جھکا شخص ڈنڈے کو کندھوں پر رکھ کر مٹی کے تیل کے دو بڑے بڑے دھاتی کنستر باندھے قریب آ گیا۔

''اسلام علیکم، ادھر پہنچ گیا۔ بہت تیز آیا آپ۔''

آواز سن کر میں مڑا اور اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ یہ وہی بوڑھا تھا جو ہمیں ہوشے کے ریسٹ ہاؤس میں ملا تھا اور ہم نے بہت مشکل سے اس سے جان چھڑائی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ بوڑھا تھوڑے سے بوجھ کے ساتھ چند کلومیٹر تک بھی ہمارا ساتھ نہیں دے سکے گا۔

''وعلیکم سلام، بابا جی آپ کدھر جا رہے ہو؟'' میں نے حیرت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''کنٹین کا تیل ادھر ہسپاں لے جاتا ہے نا، ابھی تھوڑی دیر میں پہنچے گا۔'' بابا جی یہ کہتے ایک روانی کے ساتھ آگے گزرتے چلے گئے۔

ہمارا یہ حال تھا کہ سر پر رکھی ٹوپی بھی اب بھاری لگتی تھی اور جوتے قدموں کو منوں وزنی معلوم ہوتے تھے۔ اور ایک یہ بوڑھا تھا جو پتہ نہیں کہاں سے چلا تھا اور چالیس کلو کے قریب وزن اٹھا کر اس کمر توڑ گلیشیر پر نان سٹاپ دوڑا چلا جا رہا تھا۔

اندازوں کی غلطی بھی انسان کو بہت کچھ سکھاتی ہے، اس بات کا احساس گونڈوگورو گلیشیر پر آ کر ہوا۔

لیلیٰ

اب شام اتر رہی تھی اور ابھی پتہ نہیں ہسپنگ کتنی دور تھا۔

علی اور سلیمان بھی ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

ہم جس مقام پر کھڑے تھے یہاں سے دونوں طرف جو پہاڑی سلسلے تھے ان پر برف تھی اور وہ بھی اتنی کہ پتھریلی چٹانیں کم اور برف کی آسمان کو چھوتی ڈھیریاں زیادہ معلوم ہوتی تھیں۔ دونوں طرف کے برفانی سلسلے آگے جا کر ایک نصف دائرے کی شکل میں مل رہے تھے اور ان بلند برفانی پہاڑوں سے پار جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ گونڈوگورو پاس شاید اسی نصف دائرے میں کہیں واقع تھا۔

گلیشیئر کا کچھ حال تو میں نے بیان کیا۔ ٹھوس برف کی نجانے کتنی موٹی تہہ پر سنگریزے، پتھر اور چٹانیں تھیں۔ اور کسی ترتیب کے بغیر بکھرے ان پتھروں اور چٹانوں کے درمیان کہیں سفید اور کہیں شیشے جیسی چمکدار برف کی سطح نظر آتی تھی۔

جہاں پتھر کم تھے وہاں گلیشیئر کے درمیان دراڑیں تھیں جو ایک طرف سے شروع ہو کر دوسری طرف پھیلتی چلی جاتی تھیں۔ ان دراڑوں کے اندر اندھیرا نظر آتا تھا اور ٹھنڈک کی شدید لہریں برآمد ہوتی تھیں۔ گلیشیئر کی سطح پر جگہ جگہ پانی کی نالیاں تھیں جن میں پانی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اکثر دراڑوں میں کہیں اوپر سے گرنے والا پانی دھار کی شکل میں ہی جم گیا تھا اور جگہ جگہ یہ برف کے نوکیلے نیزے نظر آتے تھے۔ گلیشیئر کی سطح پر کہیں کہیں پتھروں کے اتنے بڑے بڑے ڈھیر بھی موجود تھے جن کے دوسری طرف نظر نہ آتا تھا۔ ان ڈھیروں پر چڑھ کر دیکھنا پڑتا تھا کہ اب آگے کا راستہ کہاں سے ہے۔

پورٹر، یاسر اور عظیم اسی طرح کے کسی ڈھیر کے پیچھے غائب ہو چکے تھے۔ زاہد کی خراب طبیعت اور اپنی تھکاوٹ کے

باعث اب ہماری رفتار نہایت کم ہو چکی تھی۔ اوپر سے جس چڑھائی پر ہم چل رہے تھے اس نے ہماری مشکلات میں کئی گنا اضافہ کر رکھا تھا اور گزشتہ چڑھائیوں کی طرح اب یہ بھی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

میرے دائیں جانب بھورے پہاڑ کا سلسلہ اب کچھ فاصلے پر ختم ہوتا نظر آ رہا تھا اور اس کے پیچھے تمام پہاڑ سفید تھے۔ سفید پہاڑوں کا یہ وہی سلسلہ تھا جو آگے جا کر بائیں طرف والے سلسلے سے مل کر اس وادی کو بند کر رہا تھا۔ میں بہت دیر سے اس انتظار میں تھا کہ یہ پہاڑ ختم ہو تو دیکھوں کے اس کے پیچھے کیا ہے۔ اور یہ سفید سلسلہ کہاں سے شروع ہو رہا ہے۔

کچھ آگے جا کر ایک نوکیلی برف پوش چوٹی نے بھورے پہاڑ کے پیچھے سے سر نکالا۔ میرے قدم تھکاوٹ کے باوجود تیز ہو گئے اور چند منٹ کی متواتر کوشش کے بعد میں نے اچانک اپنا رک سیک پھینکا اور ایک پتھر پر مبہوت ہو کر بیٹھ گیا۔

اس بھورے پہاڑ کے پیچھے سے جو چوٹی برآمد ہوئی وہ میری توقعات سے کہیں زیادہ دلکش تھی۔ اتنی دلکش کہ میں نے اس سے پہلے کبھی ایسی خوبصورت چوٹی نہ دیکھی تھی۔

مجھے محسوس ہوا کہ یہاں تک آنے کی وہ تمام مشکلات جنہوں نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا وہ اس ایک منظر کے مقابلے میں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ اس قدر خوبصورت چوٹی کا تذکرہ ابھی تک کسی نے بھی نہیں کیا تھا اور میں اس کے نام تک سے نا آشنا تھا۔

سب لوگ گونڈوگورو کا ذکر کرتے، گلیشیئر اور مشہ بروم کے بارے میں بتاتے کوئی چوغولیزا کی کہانیاں سناتا لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ گلیشیئر پر ایک جگہ ایسی بھی آئے گی جہاں تم دنیا کی سب سے خوبصورت چوٹی دیکھو گے۔

میں نے فوراً رک سیک سے ٹریکنگ گائیڈ نکالی، گونڈوگورو گلیشیئر کا نقشہ دیکھا اور گونڈوگورو پاس کے دائیں طرف تین چوٹیوں کے ناموں پر آ کر رک گیا۔

جبجیالی، باسوا اور لیلیٰ!

نقشے کے مطابق اس چوٹی کا نام لیلیٰ بنتا تھا۔ اور اس چوٹی کا نام لیلیٰ ہی ہو سکتا تھا۔ اس چوٹی کو دیکھ کر اور یہ نام سن کر خود بخود اس بات پر یقین ہو جاتا ہے کہ یہ نام اسی کا ہے۔

لیلیٰ پیک بہت زیادہ بلند تو نہیں لیکن خوبصورتی میں شاید ایسی چوٹی کوئی نہ ہو۔ چھ ہزار چار سو میٹر بلند اس چوٹی کی

ترچھی سطح پر برف کی موٹی تہیں تھیں اور اطراف کی پتھریلی دیواریں اتنی سیدھی تھیں کہ اس پر برف کے ٹھہرنے کے کوئی امکانات نہیں تھے۔ گلیشیئر جہاں سے یہ چوٹی ایک دم بلند ہو رہی تھی وہاں برف کے ڈھیر تھے اور یہ ڈھیر گول گول گیندوں نما برف کے ڈھیلوں پر مشتمل تھے۔

''یار، اللہ سوہنے دی شان جے۔ ہم کدھر آ گئے؟ شاہ جی، اس چوٹی کا کیا نام ہے؟''

زاہد جو میری طرح پتہ نہیں کب سے گم سم کھڑا لیلیٰ کی طرف دیکھے جا رہا تھا، اچانک بول پڑا۔

میں نے کتاب سے حاصل کردہ معلومات زاہد کو بھی فراہم کیں اور رک سیک اٹھا کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ باقی ٹیم کا کچھ اتا پتہ نہ تھا کہ وہ کس طرف گئے ہیں اور اب میں اور زاہد اس طویل و عریض گلیشیئر کی سطح پر دھیرے دھیرے چل رہے تھے۔

کچھ آگے چلے تو کچی برف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں آ کر میں رک گیا۔

''کیا ہوا؟'' زاہد نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم غلط سمت میں جا رہے ہیں۔ ادھر برف کچی ہے اور اس پر اگر کوئی گیا ہوتا تو اس کے پیروں کے نشان ضرور نظر آتے۔ ہمیں راستہ تلاش کرنا ہوگا۔'' میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

عموماً ان راستوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چند پتھر اوپر تلے رکھ کر ایک نشان بنا دیا جاتا ہے جس سے راستے کے تعین میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ کام زیادہ تر مقامی پورٹر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ گلیشیئر اور کٹی پھٹی زمین پر لینڈ سلائیڈنگ یا گلیشیئر کے ٹوٹنے کے باعث راستہ بدل جاتا ہے اور اس کے علاوہ نئے لوگوں کو تو راستے کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ نشان ٹریکنگ میں سیاحوں کے لئے روشنی کے میناروں کا کام دیتے ہیں۔

کافی دیر چاروں طرف نظریں دوڑانے کے باوجود دور دور تک ایسا کوئی نشان نظر نہ آیا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پیچھے کی طرف پتھروں کی بہتات تھی اور اتنے پتھروں میں ایک ڈیڑھ فٹ کا نشان نظر آنا ویسے بھی آسان نہ تھا۔

یہاں دائیں طرف لیلیٰ پیک تھی اور اب اتنے قریب تھی کہ اگر اس برف پر کسی کھائی میں گرے بغیر ہم چلتے تو شاید پندرہ بیس منٹ میں چوٹی کی بنیاد تک پہنچ جاتے۔ بائیں جانب پتھروں کی ایک بلند دیوار تھی جس کی دوسری جانب کچھ نظر نہ آتا تھا اور سامنے کافی فاصلے پر وادی کا اختتام ایک انتہائی بلند سفید دیوار کی شکل میں تھا۔

میں آس پاس کے بڑے بڑے پتھروں پر چڑھتا دور دور تک نظر دوڑاتا اور کوئی نشان نہ پا کر کچھ دور کسی اور اونچے

پتھر کی طرف دوڑتا۔

یوں تو تمام دن برفانی ہوائیں تیز رفتاری سے ہم سے ٹکراتی رہی تھیں لیکن دھوپ میں ان کا مقابلہ کرنا زیادہ مشکل نہ تھا۔ جوں جوں سورج ڈھل رہا تھا اور ہم سفید برف پر چلنا شروع ہوئے تھے یہ ہوائیں حواس معطل کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''یاسر، عظیم!!!!'' زاہد نے اچانک زور زور سے آوازیں دینا شروع کیں۔

اس کی آواز اس ویرانے میں آس پاس کے پہاڑوں سے ٹکرا کر ایک بازگشت پیدا کرتی جو دیر تک سنائی دیتی اور پھر سوائے ہوا کی آواز کے ہر طرف مکمل سکوت چھا جاتا۔

شاید ہماری ٹیم ان آوازوں کی پہنچ سے دور جا چکی تھی۔

اب خود ہی راستہ تلاش کر کے کم سے کم آرام کرتے ہوئے منزل تک پہنچنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

دائیں طرف پتھروں کا جو اونچا ڈھیر تھا اس کے اور ہمارے درمیان بھی کچی برف حائل تھی اور واپس جا کر ایک لمبا چکر کاٹ کر اس دیوار تک پہنچنا بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور مصیبت جو اس طریقے پر عمل کرنے میں حائل تھی وہ ایک گہری پتھروں سے لبریز کھائی تھی۔ یعنی پتھروں کو پھلانگتے ہوئے کافی نیچے تک جانا اور پھر ایک سیدھی چڑھائی پر پتھروں سے اوپر چڑھنا!

کوئی چارہ کار نہ دیکھتے ہوئے میں نے آہستگی سے برف پر چلنا شروع کیا اور اپنا رخ پتھروں کی دیوار کی طرف کر لیا۔

شروع میں میرے بوٹ برف میں دھنستے اور چلنے میں زیادہ دشواری نہ ہوتی تھی۔ جوں جوں آگے بڑھا، برف کی تہہ گہری ہوتی گئی۔ میں رکا اور زاہد کو واکنگ سٹک سے برف کی گہرائی ناپ کر آگے بڑھنے کا کہا۔ یہاں کسی بھی قدم پر ایسی کوئی دراڑ ہو سکتی تھی جو ہم نے پیچھے لاتعداد دیکھی تھیں۔ اور ایسی کسی صورت میں ہم دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسری کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم پورٹروں سے پیچھے رہے اور انہیں خود سے بہت دور جانے دیا۔ اس کے علاوہ زیادہ آرام اور زاہد کی سست رفتاری کی وجہ سے مجبوراً مجھے بھی پیچھے رہنا پڑا اور ہم راستے سے بھٹک گئے۔ رہی سہی کسر لیلیٰ پیک کے اس ہوشربا نظارے نے پوری کر دی جس میں کھو کر ہمیں وقت کے گزرنے اور حالات کا درست اندازہ کرنے کا

احساس ہی نہ رہا۔

ہم دونوں سٹک کو برف میں پیوست کرتے اور جب سٹک کسی ٹھوس چیز پر جا کر رک جاتی تو برف سے پیر نکال کر ایک قدم آگے رکھتے۔ یوں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہم نے چند میٹر کا فاصلہ طے کیا اور۔۔

ایک جگہ ٹھوس جگہ پر سٹک رکنے پر میں نے سٹک نکالی اور قدم آگے بڑھایا۔۔

قدم پر جسم کا زور آیا ہی تھا کہ غڑاپ سے میں برف کے اندر دھنستا چلا گیا۔ توازن بگڑنے اور زور سامنے کی طرف ہونے سے میرا منہ برف پر لگا۔ ایک دفعہ تو لگا کہ وہ ہو گیا جس کا ڈر تھا۔ یعنی منہ کھولے منتظر کسی برفانی کھائی نے بالآخر اپنا شکار حاصل کر ہی لیا۔ لیکن پھر قدموں کے نیچے کسی سخت سطح نے دھنسنے کا یہ عمل روک دیا۔ شاید یہ کسی کھائی کا آغاز یا اختتام تھا جس میں کوئی پتھر پھنسا ہوا تھا اور میں بھی پیٹ تک ہی برف میں دھنسا تھا مکمل نہیں!

''اوہ، شاہ جی، دھیان نال'' زاہد کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''احتیاط سے آگے آؤ اور مجھے باہر نکالو'' میں نے منہ اور آنکھوں سے برف کے ذرے ہٹاتے ہوئے زاہد کو اپنی مدد کے لئے بلایا۔

جوں ہی زاہد میرے قریب آیا اس کے ساتھ بھی وہی ہوا جو میرے ساتھ ہوا تھا۔

اب صورتحال یہ تھی کہ ہم دونوں کمر تک برف میں دھنسے ہوئے تھے، اور قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی مدد سے قاصر تھے۔ جونہی ہم جنبش کرتے ہمارے جسم برف میں کچھ اور دھنس جاتے۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا کہ ہمارے قدموں کے نیچے کیا ہے اور ہم کس چیز پر رکے ہوئے ہیں۔ اگر یہ کوئی ٹھوس چیز ہوتی تو معمولی سی حرکت پر ہم اس طرح دھنستے نا چلے جاتے۔ مکمل طور پر اس برفانی دلدل کی تہہ میں اترنے کے خوف نے ہم پر سکتہ سا طاری کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے کندھوں پر رک سیکوں کا وزن بھی تھا۔ برف کے اندر ہمارے جسم برف بنتے جا رہے تھے اور باہر شدید برفانی ہوا ہمیں منجمد کرتی تھی۔ تمام دن کی شدید تھکاوٹ اور ان برفانی ہواؤں نے ہمارے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیئے تھے۔

یاسر، عظیم اور چاروں پورٹر پتھروں اور برفوں کے اس لامحدود نشیب و فراز میں کہیں گم ہو چکے تھے اور ہم اس نقطہ انجماد سے کہیں نیچے کے درجہ حرارت پر چند ہی لمحوں میں شروع ہونے والی رات کے خیال کو ذہن سے جھٹلانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔

اب شام کے سورج کی آخری کرنیں لیلیٰ چوٹی کی تکون پر آہستہ آہستہ اوپر کی طرف سرک رہی تھیں۔اس کی بلند ڈھلوانوں پر جمی برفیں نہایت تیزی سے سرمئی چاندی کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھیں۔

ہمارے منہ سے سانس لینے پر بھاپ نکلتی تھی اور کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب کیا کیا جائے۔اعصاب کو منجمد کر دینے والے اس سکوت کو بالآخر زاہد نے توڑا۔اس نے اس یقینی برفانی موت سے نکلنے کی موہوم سی امید کا اظہار ایک سوال کی صورت میں کیا

''شاہ جی! سلیپنگ بیگ ہیں؟''

آج صبح سامان باندھتے وقت ہم نے کل کی چڑھائی کے تجربے کے بعد کچھ وزن کم کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنے سلیپنگ بیگ پورٹروں کے سامان میں بندھوا دیئے تھے۔

"نہیں!"

جواب یقیناً مایوس کن تھا لیکن کوئی اور جواب میرے پاس تھا بھی نہیں!

صاف نظر آ رہا تھا کہ گونڈوگورو گلیشیئر میں دھنسے ہمارے بھوک اور تھکاوٹ سے نڈھال وجود زیادہ دیر اس اذیت ناک ٹھنڈ کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔

مختصر قبیلہ، سادہ تمنائیں

نچلے دھڑ کو ساکت رکھتے ہوئے میں نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا، دور دور تک سکوت تھا اور کائنات ہماری بیچارگی کا تماشا دیکھنے کے لئے ٹھہری ٹھہری دکھائی دیتی تھی۔

بائیں جانب پتھروں کی کھائی میں معمولی سی حرکت دکھائی دیتی تھی۔شاید کچھ پتھر بلندی سے لڑھکے تھے۔ایک موہوم سی امید پر میں نے پوری طاقت صرف کرتے ہوئے آواز دی۔

''علی!!''

زاہد نے بھی ایک دم پیچھے مڑ کر دیکھا۔

''کیا علی نظر آیا ہے؟'' کچھ نا نظر آنے پر وہ میری طرف مڑا۔

''کچھ حرکت نظر آئی تھی، میں نے سوچا آواز دوں، شائد علی وغیرہ گزر رہے ہوں۔لیکن شاید میرا وہم تھا'' اپنی آخری امید پر بھی پانی پھرتے بلکہ برف جمتے دیکھ کر میری آواز دھیمی ہو گئی۔

میری نظریں ایک دفعہ پھر لیلیٰ کی طرف اٹھیں۔

کیا یہ حسین نظارہ ہماری زندگی کا آخری منظر تھا؟

قدرت کے حسن و اسرار سے ہماری غیر معمولی دلچسپی کا افسانہ کیا اپنے اختتام کو پہنچنے والا تھا؟

صرف دو ڈھائی فٹ کی مزید گہرائی میں اترنے کے بعد کسی کو ہم قریب سے بھی نظر نا آتے۔اور اگر یہ دو تین فٹ کا فاصلہ طے ہو گیا تو پھر۔۔۔

زندگی میں پہلی مرتبہ ذہن میں مایوسی کے وہ خیالات سر ابھار رہے تھے جن سے پہلے میں آشنا نہ تھا۔

''شاہ جی، کوئی ہے۔۔ادھر دیکھو!''

اچانک زاہد پر جوش آواز میں بولا۔

میں بری طرح چونکا اور مڑ کر پھر اسی کھائی کی طرف دیکھا جہاں دوسر آہستہ آہستہ ابھرے اور بلندی پر آ کر واضح ہو گئے۔

زاہد نے ایک دفعہ پھر زور سے آواز دی اور اپنا رومال ہلانا شروع کر دیا۔ یہ علی اور سلیمان تھے جو مرحوم یعقوب کو چھوڑ کر آ رہے تھے۔

ہمیں دور سے ہی پہچان کر ان دونوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ قریب آ کر دونوں بے دریغ کچی برف میں اتر گئے اور تیزی سے ہمارے پاس آئے۔

''احتیاط سے آگے آنا اور ہمارے بالکل قریب نا آؤ یہاں کھائی ہے! ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لو''

ان کی تیز رفتاری دیکھ کر میں نے چیختے ہوئے کہا۔

''سر آپ ادھر کیا کرتا ہے؟ باقی لوگ کہاں ہے؟'' سلیمان نہایت حیران تھا۔

''یار پہلے یہ سامان پکڑو اور باہر نکلو پھر بات کرتے ہیں'' زاہد نے تقریباً رونے والے لہجے میں کہا۔

ہمارے رک سیک لینے کے بعد ان دونوں نے ہمیں بھی باہر کھینچا اور اس اذیت ناک ٹھنڈ سے نجات دلائی جس میں ہمارا نچلا دھڑ سن ہو چکا تھا اور ہمیں ڈر تھا کہ پتہ نہیں اب ہم حرکت بھی کر سکیں گے کہ نہیں۔ 'سنو بائیٹ' کا خیال آتے ہی ایک دفعہ میں اندر تک دہل گیا۔

برف پر رینگتے اور کپڑوں پر سے برف جھاڑتے کچھ دیر میں ہماری ٹانگوں نے حرکت شروع کر دی۔ گو ہمارے کپڑے بھیگ چکے تھے اور بوٹوں کے اندر برف جانے کی وجہ سے پیر جسم کا حصہ محسوس ہی نہ ہو رہے تھے لیکن جان بچنے پر دل کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کیا۔

آہستہ آہستہ جسم کو حرکت دیتے اور پھر چار پانچ منٹ تک جاگنگ کے انداز میں اچھلنے سے جما ہوا دوران خون کچھ بحال ہوا۔ ہمارے رک سیک چونکہ اب علی اور سلیمان نے اپنے سامان کے ساتھ باندھ لئے تھے اس لئے ہم اب کچھ ہلکا ہلکا محسوس کر رہے تھے۔

''ہسپنگ کتنی دور ہے؟'' میں نے سلیمان سے پوچھا۔

''تھوڑا دور ہے تیز چلو تو پندرہ بیس منٹ میں پہنچے گا''۔

یہ ایک مشکل بات تھی، یعنی تیز چلو!

لیکن مجبوری تھی، بھوک، تھکاوٹ، ٹھنڈ کی شدت، ہواؤں کی تندی اور گیلے کپڑے اور جوتے۔ ان حالات میں ہمیں صرف گرم چائے، کھانے اور سلیپنگ بیگ کی ضرورت تھی، چلنے کی نہیں۔ لیکن چلنے کے علاوہ زندگی تک پہنچنے کا کوئی اور طریقہ ممکن نہ تھا۔

خیر، سلیمان اور علی نے کچی برف کے کنارے کنارے اسی پتھریلی دیوار کی طرف چلنا شروع کیا جدھر میں اور زاہد جانا چاہتے تھے۔ ایک جگہ کچی برف پھر سامنے آ گئی اور یہاں کوئی اور راستہ ممکن نہ تھا۔ علی اور سلیمان نے ایک ثانئے کے لئے برف کا جائزہ لیا اور برف میں اتر گئے۔ تیزی سے چلتے ہوئے وہ دونوں برف سے پار ہوئے اور دیوار کے نیچے کھڑے ہو کر ہمیں دیکھنے لگے۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ان کے قدموں کے نشانات پر چلتے ہوئے بالآخر دوسری طرف پہنچ ہی گئے۔

جن پتھروں پر چلنا اب تک مشکل ترین کام دکھائی دیتا تھا اب وہی پتھر آسان ترین راستہ دکھائی دے رہے تھے!

بہت مشکل سے پتھروں کی یہ دیوار چڑھی گئی۔ آگے ایک شدید اترائی کے بعد نسبتاً ہموار راستہ تھا۔ پتھر کی یہ دیوار آگے جا کر چوڑی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے بائیں جانب کا منظر ابھی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

یہاں بھی پتھر تھے لیکن حیرت انگیز طور پر چوڑی سلوں کی طرح تھے۔ تیز رفتاری سے چڑھائی اترائی کے بعد اب جسم رواں ہو رہا تھا۔ ٹھوس برف میں دھنسے ان پتھروں پر چلنا کافی آسان تھا۔

کچھ آگے جا کر میں نے مڑ کر پیچھے اور دائیں جانب نظر دوڑائی۔

لیلیٰ کا نچلا حصہ پتھروں کے اس ڈھیر کے پیچھے چھپ گیا تھا جسے ہم ابھی پار کر کے آئے تھے۔ لیلیٰ کی نوکدار تکون کے عین نیچے کھائی کے اختتام پر ایک چوڑی چٹان پر پتھروں کا وہ نشان دکھائی دیا جس کے نا ملنے کی وجہ سے ہم برف میں اترنے پر مجبور ہوئے تھے۔ راستہ پتھروں والی اس کھائی میں سے ہی تھا جسے ہم کسی بھی صورت میں گزرگاہ نہ سمجھے تھے۔

چلتے چلتے بائیں طرف کا پہاڑی سلسلہ ہمارے سر پر آ گیا۔

پتھروں والی دیوار یہاں سے سیدھی ہوگئی اور بلند پہاڑوں کے درمیان اس گول پیالہ نما وادی کو دو حصوں میں تقسیم کرتی دکھائی دی۔ایک طرف گلیشیئر اور دوسری طرف۔۔

دوسری طرف ایک میدان جہاں ہلکے اندھرے میں دور سے بھی خیمے لگے نظر آرہے تھے۔

ایک سرد شگنجے سے نکلنے کے بعد اس میدان میں قائم ایک خیمہ ہمارے لئے آسائشوں سے بھرے محل کی مانند تھا۔

ایک ایسی جگہ جہاں خوراک ہوگی، چولہا ہوگا، سونے کا موقع ہوگا اور۔۔۔اور یاسر اور عظیم ہوں گے۔

بدحال خانہ بدوشوں کا یہ قبیلہ بہت مختصر تھا اور ہماری تمنائیں سمٹ کر صرف تین رہ گئی تھیں!

جسمانی زور تو نجانے کب کا ختم ہو چکا تھا، اب ہم اپنی زندگی کی جنگ لڑنے کے لئے کسی انجانی طاقت کے سہارے چل رہے تھے۔اسی حالت میں کسی طرح ہم میدان پار کر کے ایک ٹھنڈے یخ پانی کے نالے پر بے ترتیب لکڑیوں کے جال پر سے گزرتے ایک بلند ٹیلے پر پہنچے۔

یہ ہسپنگ تھا جہاں ایک طرف ہمارا کیمپ لگا ہوا تھا اور قریب ہی دونوں ابراہیم، یاسر اور عظیم پتھروں کی ایک چار دیواری کے اندر جلتے چولہے کے اردگرد سر جھکائے بیٹھے تھے۔

قدموں کی آواز سن کر وہ چونکے اور ہمیں دیکھتے ہی اچھل کر کھڑے ہوگئے۔

''ہم ٹھیک ہیں! میں کیمپ میں جارہا ہوں''

ان کی طرف سے امکانی سوالات کی بوچھاڑ سے بچنے کے لئے میں نے جلدی جلدی کہا اور کیمپ کی طرف چل پڑا۔

''سر! کہاں چلا گیا تھا، ادھر سب پریشان ہوگیا؟''

راستے میں ایک دم سامنے آنے والا علی حسن تھا جس کے چہرے پر تشویش کے آثار واضح تھے۔

''علی حسن، کیا حال ہیں۔ہم راستہ بھول گئے تھے، آپ سے کل گپ شپ ہوگی ابھی حال بہت برا ہے''۔

میں فوراً کیمپ میں گھس گیا۔اس وقت منہ سے الفاظ نکالنا بھی انتہائی مشکل تھا اور طبیعت چڑچڑے پن کی انتہا پر تھی اس لئے مناسب یہی تھا کہ خاموشی سے آرام کیا جائے۔

زاہد پہلے سے ایک سلیپنگ بیگ میں کپکپا رہا تھا اور اس نے کسی سے دعا سلام کرنے کی زحمت تک نہ کی تھی۔گیلے کپڑے تبدیل کر کے سلیپنگ بیگ میں لیٹنے کے بعد مجھ پر بھی کپکپی طاری ہوگئی۔

یہ شائد تھکاوٹ کی انتہا اور جسم میں سرائت کر جانے والی اس سردی کے اثرات تھے جو کافی دیر برف میں رہنے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔چلنے کی وجہ سے جسم میں جو گرمی پیدا ہوتی رہی تھی اب لیٹنے کے بعد وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔

پہاڑ ہمیں دوست بنا دیتے ہیں

''سر، چائے لو اور کچھ کھاؤ۔ یاسر بھائی باہر بلاتا ہے۔'' کیمپ کی دیوار کو کسی نے انگلی سے کھٹکھٹایا۔

زاہد نے تو جنبش نہ کی لیکن میں دھیرے دھیرے اٹھا اور چولہے کے پاس بیٹھنے کے خیال سے باہر نکل آیا۔

آواز دینے والا علی حسن تھا جو کسی پورٹر کو بھیجنے کے بجائے خود ہی چلا آیا تھا۔

''شکریہ، علی حسن''

میں پتھروں کی چار دیواری میں آ گیا جہاں پورٹر، عظیم اور یاسر بیٹھے ہوئے تھے۔

چولہے کے پاس بیٹھ کر خاصا سکون محسوس ہوا۔ گرم چائے نے بھی کچھ اثر دکھایا اور میں نے طبیعت میں کچھ بہتری محسوس کی۔

سب لوگ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ یقیناً وہ میری زبانی تفصیل سے کچی برف تک پہنچنے اور اس کے اندر دھنسنے کے واقعات سننا چاہتے تھے۔ علی اور سلیمان نے انہیں لیلیٰ پیک کے نیچے برف کے قیدیوں کی مصیبت اور رہائی کا بتایا ہوگا۔

کچھ دیر منتشر خیالات کو یکجا کرنے کے بعد میں نے راستہ بھولنے اور علی اور سلیمان کی مدد سے وہاں سے نکلنے کی داستان سنائی۔

''اللہ کا شکر ہے اطہر صاحب، ہماری پریشانی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ہمیں سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ آپ لوگوں کی تلاش کے لئے کیا کیا جائے۔ میں اور یاسر بہت دور تک واپس گئے لیکن گلیشئر اور پتھروں کے پیچھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم ابھی واپس آ کر بیٹھے ہی تھے کہ آپ لوگ پہنچ گئے۔'' عظیم نے بتایا۔

''زاہد کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ بہت آہستہ چلتا رہا اور میں نے بھی اسے اکیلا چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ پھر لیلیٰ

پیک پر نظر پڑی تو ہماری ساری توجہ اس کی طرف ہی ہو گئی۔''

''نہیں، کیا تمہیں لیلیٰ کے اوپر سے راستہ نظر آ رہا تھا؟ اوپر کوئی کیمپ لگے ہوئے تھے۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ تمہارے ساتھ پہاڑوں میں جانا ٹھیک نہیں۔ شکر ہے میں پورٹروں کے ساتھ تھا ورنہ میرا بھی کام ہو جانا تھا۔'' یاسر کو ہماری لاپرواہی پر شدید غصہ تھا۔

''علی حسن، یہاں سارے راستے مجھے پتھروں کے نشان بہت کم دکھائی دیئے۔ کیا اس کا باقاعدہ انتظام نہیں کرتے آپ لوگ؟'' اچانک ایک خیال آتے ہی میں نے علی حسن سے سوال کیا۔

''کرتا ہے نا سر۔ نشان بناتا ہے، جو پورٹر ادھر سے جاتا ہے وہ نشان دیکھتا ہے اور گرا ہو تو ٹھیک کرتا ہے۔''

علی حسن تو محسوس ہی کر گیا۔

''پھر شائد ہم شروع سے ہی غلط راستے پر تھے جو یہ نشان ہمیں نظر نہیں آئے۔''

مجھے احساس ہوا کہ گلیشئیر پر آنے کے بعد میری توجہ راستے پر بہت کم اور ارد گرد کے مناظر پر بہت زیادہ تھی۔ تھک کر جب بھی بیٹھتا تھا میری نظریں کسی نہ کسی حیرت انگیز منظر پر جم جاتی تھیں اور اسی وجہ سے میری رفتار بھی بہت آہستہ رہی۔

اب رات کا آغاز ہو چکا تھا۔

پہاڑی علاقوں میں رات اترنے کے بعد بھی کافی دیر تک روشنی باقی رہتی ہے اور چیزیں دھندلی دکھائی دیتی رہتی ہیں۔ شاید سفید برف کی وجہ سے روشنی منعکس ہوتی رہتی ہے یا کوئی اور وجہ ہو بہر حال ابھی تک ارد گرد کا منظر ہم دیکھ سکتے تھے۔

اچانک ہسپنگ کے اس پرسکوت ماحول میں ایک سرسراہٹ ابھری اور ایک طرف سے دوسری طرف پھیلتی چلی گئی۔

ہم سب ایک دم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

ہمارے بالکل سامنے باسو پیک تھی جس کے دائیں طرف لیلیٰ اور بائیں طرف جنجیالی کی چوٹیاں تھیں۔

باسو پیک سے برف کا ایک تودہ بہت تیزی سے نیچے کی طرف لڑھکا اور گلیشئیر کی سطح پر ڈھلوان کی طرف بہتا چلا گیا۔ اس طرف جہاں کچھ ہی دیر پہلے تک میں اور زاہد برف کی قید میں تھے۔ پتھروں کی اس دیوار نے جو گلیشئیر اور

ہسپنگ کے درمیان واقع تھی، برفانی تودے کو اس کیمپ سائیٹ کی طرف آنے سے روک دیا تھا۔ تھوڑی دیر میں برف کا ایک بادل پورے علاقے پر چھا گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے سفید چونے سے بھرے کسی میدان سے کوئی ٹرک تیز رفتاری سے گزرا ہو اور چونا چاروں طرف پھیل گیا ہو۔

یہ منظر دیکھنے میں نہایت خوبصورت لیکن ہمارے ارادوں کے لئے انتہائی خطرناک تھا۔ مجھے اب سمجھ آئی کے بہت سی بلند چوٹیوں پر دور سے جو بادل دکھائی دیتے ہیں ان کی ایک وجہ برف کا لڑھکنا بھی ہوتا ہے۔ دور سے دیکھنے پر یہ اڑتی برف یقیناً ایک بادل ہی دکھائی دیتی ہوگی۔

راستے میں گپ شپ کے دوران ہم نے ایولانچ (برفانی تودہ) گرنے کے واقعات پر بھی بحث کی تھی۔ عظیم کا کہنا تھا کہ ایولانچ آنے سے بہت آواز پیدا ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی دھماکہ ہوا ہو۔

ہم میں سے کسی نے بھی اس سے پہلے ایولانچ گرتے نہیں دیکھی تھی۔ لیکن میرا خیال تھا کہ ان پہاڑوں پر جہاں برف بہت زیادہ ہوتی ہے یہ ایک معمول ہے۔ اور اگر اتنی ہی آواز ہوتی ہو تو یہ علاقے دھماکوں کی آواز سے ہی گونجتے رہیں۔

خیر اس وقت تو ہم کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکے لیکن اب اس ایولانچ کو دیکھ کر میرا خیال کافی حد تک درست ثابت ہوا۔ البتہ اگر کہیں ٹھوس برف جیسے گلیشیئر کی ہوتی ہے ٹوٹے تو ممکن ہے دھماکے کی آواز پیدا ہوتی ہو۔ گلیشیئر کے آس پاس یا اوپر چلتے ہوئے ہم نے کئی دفعہ تڑاخے کی آوازیں سنی تھیں لیکن وہ اس قدر بلند نہیں تھیں کہ انہیں دھماکہ کہا جا سکے۔

کچھ دیر بعد ہم سب سونے کے ارادے سے کیمپ میں لیٹ چکے تھے۔

زاہد پہلے ہی سویا ہوا تھا۔ گو ٹھنڈ شدید تھی لیکن پھر بھی لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ آنکھ اسی وقت کھلی جب علی نے کیمپ کی دیوار کو کھٹکھٹایا اور کئی دفعہ زور زور سے آوازیں دیں۔

کیمپ پر دھوپ تھی جس کی وجہ سے اندر کا ماحول خوب گرم گرم ہو رہا تھا اور باہر نکلنے کا دل نہیں کرتا تھا۔ خیر کوشش کر کے پہلے سلیپنگ بیگ اور پھر کیمپ سے باہر نکلا۔

صبح کی کھلی کھلی دھوپ اور نیلگوں آسمان کے نیچے لیلیٰ کا حسن بھی نکھر آیا تھا۔

چوٹی پر جمی نیلگوں برف دھوپ سے جگمگا رہی تھی اور اس قدر چمکدار تھی کہ اس کی طرف دیکھنا دشوار تھا۔

میں نے صابن اور دیگر ضروری سامان لیا اور منہ ہاتھ دھونے کی نیت سے ٹیلے کے نیچے نالے کی طرف چل پڑا۔

یہ پانی قریب کی برفوں سے پگھل کر آ رہا تھا لہٰذا مجھے توقع تھی کہ اسے استعمال کرنا آسان نہیں ہوگا۔

صابن وغیرہ کو پاس رکھ کر میں نیچے بیٹھا اور ڈرتے ڈرتے پانی میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ ہاتھ ایک شیشے کی چادر سے جا ٹکرائے! یہ چادر اس قدر شفاف تھی کہ اس کے نیچے بہتا پانی صاف نظر آ رہا تھا اور پہلی نظر میں محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اوپر کا پانی جم کر ایک شیشے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

اٹھا، واپس آیا اور ابراہیم سے پانی گرم کرنے کو کہا۔

ناشتے میں وہی پوری اور پراٹھے کی درمیانی جنس چائے کے ساتھ پیش کی گئی۔

آج کا پروگرام یہ تھا کہ ہم شام چھ بجے تک یہاں آرام کریں گے۔ شام کو یہاں سے گونڈوگورو بیس کیمپ جائیں گے جو لگ بھگ ڈیڑھ دو گھنٹے کا فاصلہ ہے۔

اطلاعات کے مطابق بیس کیمپ میں ٹھنڈ اور کچی برف بہت ہے اس لئے وہاں سارا دن رکنا مشکل ہوگا۔ رات بارہ بجے تک وہاں رک کر ہم گونڈوگورو پاس پر چڑھیں گے۔ پاس کا راستہ کم لیکن چڑھائی شدید ہے اس لئے علی الصبح پاس پر پہنچیں گے اور آس پاس کا نظارہ کرنے اور تصاویر بنانے کے بعد دوسری طرف واقع علی کیمپ پہنچیں گے۔

رات کی پرسکون اور گہری نیند کے بعد طبیعت بہت بشاش تھی۔

کل کے واقعات یاد کر کے اب بھی دل دھڑکتا تھا لیکن جب بھی میں ان لمحات کو سوچتا اللہ کے مسبب الاسباب ہونے کا یقین پختہ ہوتا چلا جاتا۔

ابراہیم جونیئر کا کہنا تھا کہ رات کو بالکل سیدھی چڑھائی چڑھنے کے لئے بہتر ہے کہ آپ آج کچھ بلندی تک جاؤ اور پھر بیشک آرام کرتے رہو۔ مجھے یہ بات اچھی لگی اور میں قریب ہی ایک بلند ہوتے پہاڑ پر جس پر تازہ گھاس اگ رہی تھی چڑھنے لگا۔

یہ راستہ ان کوہ پیماؤں کے استعمال میں رہتا تھا جو گونڈوگورو پیک پر چڑھتے تھے۔ یہاں چڑھائی تو تھی لیکن زیادہ مشکل نہیں۔ بلندی پر آنے کی وجہ سے سانس بہت جلدی چڑھ جاتا تھا اس لئے میں رک کر سانس بحال کرتا اور اوپر چڑھنے لگتا۔ آخر میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں سے برف کا آغاز ہو رہا تھا۔

میں نے مڑ کر نیچے دیکھا۔ کیمپ سائیٹ اور لوگ بہت چھوٹے چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ میں کافی بلندی پر آ چکا تھا۔ یہاں سے جس سمت بھی دیکھتا کوئی ایسا منظر میرا منتظر ہوتا جو میری توقعات سے کہیں زیادہ شاندار تھا۔

لیلیٰ پیک کی ترچھی ڈھلوان یہاں سے زیادہ واضح ہو چکی تھی۔ یہ چوٹی دنیا بھر میں بلاشبہ ایک انوکھے حسن کی وجہ سے مانی جاتی ہوگی۔ آس پاس کی دوسری چوٹیاں یعنی جنجیالی اور باسو کا نظارہ بھی شاندار تھا۔

یہاں سے گونڈوگورو گلیشیئر ایک ایسی سڑک کی مانند نظر آتا تھا جو ایک ڈھلوان کی طرف مڑتی جا رہی ہو۔ جس بلند مقام پر میں کھڑا تھا یہاں سے بائیں جانب ایک وسیع علاقہ صرف اور صرف برف سے بھرا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک گہری کھائی تھی جس میں آس پاس کی تمام بلندیوں سے برف جمع ہوتی رہی ہو اور اب یہ کھائی برف سے اتنا بھر چکی ہے کہ ایک میدان کی شکل اختیار کر لی ہے۔

اس میدان میں سرمئی مائل کئی لکیریں نظر آتی تھیں جیسے کسی فریش کریم کیک پر ڈیزائننگ کی گئی ہو۔ یہ لکیریں یہاں سے جتنی خوبصورت دکھائی دیتی تھیں مجھے یقین تھا کہ قریب جانے پر یہ یقینی موت کے غار ہوں گے۔ یہ ان دراڑوں کے کھلے ہوئے منہ تھے جن میں جانے کے بعد کوئی معجزہ ہی انسان کو زندہ یا مردہ باہر لا سکتا ہے۔ یہ میدان مجھ سے چند میٹر دور سے شروع ہوتا تھا اور بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔

واپس آ کر میں پتھریلی چار دیواری میں بیٹھ گیا اور چائے کا کہا۔

یاسر اور عظیم بھی وہیں تھے اور خوش گپیوں میں مگن تھے۔

زاہد ابھی تک ٹھیک نہیں تھا اور درد کے باعث سر پر ایک رومال باندھ کر دھوپ سینک رہا تھا۔ زاہد کے بارے میں مشورہ ہوا۔ سب کی رائے یہی تھی کہ زاہد کو اس حالت میں آگے لیجانا خطرناک ہوگا۔ زاہد سے پوچھا گیا تو اس نے بھی آگے جانے سے انکار کر دیا۔

''آپ جاؤ، میں آج شام تک آپ کے ساتھ رہوں گا اور کل صبح علی حسن سے کہہ کر کسی کے ساتھ ہوشے واپس چلا جاؤں گا۔ مجھ میں ہمت نہیں ہے آگے جانے کی۔ ویسے بھی میں نے یہاں تک جو دیکھ لیا ہے وہ میرے لئے بہت ہے۔ اس سے زیادہ خوبصورت علاقہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ آپ میری فکر مت کرو۔''

ایک مختصر سی ٹیم سے ایک اہم ممبر کی کمی ہم سب کو اداس کرنے کے لئے کافی تھی۔ لیکن حالات کا تقاضا یہی تھا کہ بلندی کے شکار کو مزید بلندی کی طرف لیجانے کے بجائے واپس بھیجا جائے۔ ایک طویل بحث کے بعد نتیجہ یہی نکلا کہ زاہد کو یہیں چھوڑا جائے اور رات کو گونڈوگورو پاس کی مہم پر نکلا جائے۔

نیچے میدان میں جہاں رنگ برنگے خیمے لگے ہوئے تھے وہاں اب گونڈوگورو پاس کی طرف سے آنے والے

غیر ملکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ صبح صبح پاس پر پہنچنے والے سیاح اب اس طرف اتر کے ہسپنگ کے اس میدان میں جمع ہو رہے تھے۔

ایک طرف چند نوجوان پورٹر کرکٹ کھیل رہے تھے۔

سب سے خوش کن اور غیر متوقع منظر اس مومی پتنگ کا تھا جو ہوا میں اڑ رہی تھی اور اس کا رخ لیلیٰ پیک کی طرف تھا۔ پتنگ کو اڑا کر کسی پتھر کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا جو ہوا کے زور پر خود ہی اڑے جا رہی تھی۔

یاسر اور عظیم علی حسن کو ساتھ لے کر میدان میں اتر گئے اور کرکٹ کھیلنے لگے۔ ایک دو گیندیں پھینکنے کے بعد دونوں ایک طرف بیٹھ گئے۔ اس بلندی پر کم آکسیجن میں بالنگ کرانا بھی کمال کی بات تھی۔ میں نیچے اترا اور پتنگ کی ڈور پکڑ کر اسے ادھر ادھر گھمانے لگا۔

کسے خبر تھی کہ ایک دن دنیا کے حسین ترین مناظر میں اور قراقرم کی ان بلندیوں پر جہاں صرف کوہ پیمائی کی باتیں سنائی دیتی ہیں ہمیں ایسے لمحات بھی میسر آئیں گے کہ ہم کرکٹ کھیلیں اور پتنگ بازی بھی کریں!

''یہ پتنگ کس کی ہے؟'' قریب سے ایک صاحب کو گزرتے دیکھ کر میں نے پوچھا۔

پہلے تو ان صاحب نے غور سے دیکھا، پاکستانی دیکھ کر حیران ہوئے اور پھر بولے ''سب کی ہے۔ یہ ہسپنگ والوں نے خوبصورتی کے لئے رکھی ہوئی ہے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

''اسلام آباد سے'' میں نے جواب دیا۔

وہ صاحب آگے بڑھے بغلگیر ہوئے اور ایک بڑے خیمے کے باہر پڑی کرسیوں کی طرف کھینچ کر لے گئے۔ پتنگ خود ہی ہوا کے دوش پر اڑتی رہی۔

''بیٹھیں جی، آپ کے ساتھ اور کتنے دوست ہیں؟ ادھر تو پاکستانی بھائی آتے ہی نہیں ہیں۔ آج پہلی دفعہ کسی پاکستانی کو میں ہسپنگ میں دیکھ رہا ہوں''۔

''جی ہم چار دوست ہیں، دو اسلام آباد سے، ایک راولپنڈی اور ایک اوکاڑہ سے ہیں۔ دو تو وہ کرکٹ کھیل کر تھکے بیٹھے ہیں ایک ادھر اوپر بیمار ہیں''۔

اتنے میں کیمپ سے ایک غیر ملکی بھی بڑا سا ہیٹ سر پر جماتا برآمد ہوا اور شائد دھوپ میں بیٹھنے کے لئے ہمارے پاس آ گیا۔ ہیلو ہائی ہوئی اور ہم پھر سے تعارف وغیرہ میں مصروف ہو گئے۔ انگریز کا نام ڈیوڈ تھا اور وہ انگلینڈ سے

تعلق رکھتا تھا۔

اتنے میں عظیم اور یاسر بھی قریب آ گئے۔ وادی شمشال سے تعلق رکھنے والے ان صاحب کا نام اسماعیل شاہ تھا اور وہ بھی ایک کمپنی کے ساتھ بطور گائیڈ کام کرتے ہیں۔ اسماعیل نے بتایا کہ وہ اسلام آباد میں سردیوں کا موسم گزارتا ہے اور عظیم کے گھر کے قریب ہی اس کا دفتر ہے۔

اس طرح 'ڈاکخانے' مل جانے کے بعد ہماری گفتگو مزید دوستانہ ہوتی چلی گئی۔ ڈیوڈ بڑی غور سے ہمارا مشاہدہ کر رہا تھا۔

''کیا آپ لوگ پرانے دوست ہیں اور یہاں اچانک ملاقات ہوئی ہے؟'' بہت چبا چبا کر انگریزی بولتے ہوئے اس نے اسماعیل سے دریافت کیا۔

''جی نہیں، ہم آج پہلی دفعہ ملے ہیں۔ ہمارا شوق مشترک ہے یعنی یہ پہاڑ، ہم ان پہاڑوں میں آتے ہیں اور پہاڑ ہمیں دوست بنا دیتے ہیں!'' اسماعیل نے انتہائی خوبصورت جواب دیا۔

ڈیوڈ نے بے یقینی سے سر ہلایا اور بولا ''یہ میرے لئے حیران کن بات ہے''۔

''یہ یعقوب پورٹر کس ٹیم کے ساتھ تھا؟'' اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے اسماعیل سے پوچھا۔

''جی وہ ہمارے ساتھ ہی تھا اور ہمیں شدید صدمہ ہوا ہے اس کی وفات کا۔ کنکورڈیا سے اوپر آتے وقت اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی لیکن ہمارے بہت کہنے کے باوجود وہ واپس نہیں گیا۔ علی کیمپ میں اس کی حالت زیادہ خراب ہوئی اور ہم نہایت مشکل سے اسے گونڈوگورو پاس کے اس طرف لے کر آئے۔ پھر کل صبح صبح ہم نے ایک پورٹر کو اس کے ساتھ ہوشے بھیجا لیکن شام کو خبر آئی کے وہ راستے میں ہی فوت ہو گیا'' اسماعیل نے تفصیل بتائی۔

''بیماری کیا تھی اسے؟'' عظیم نے استفسار کیا۔

''یہاں بلندی کا اثر ہی سب سے بڑی بیماری ہے۔ پہلے سر میں درد ہوتا ہے، پھر انسان شعور کھو دیتا ہے اور الٹیوں کے ساتھ کسی بھی وقت ہارٹ اٹیک وغیرہ ہو سکتا ہے۔ اصل میں یہاں تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے مقامی پورٹر خود کو ان اثرات سے محفوظ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال یہی ہوتا ہے کہ ہمیں بلندی سے کچھ نہیں ہو سکتا اور سمجھانے پر انہیں یہ شک ہوتا ہے کہ شاید انہیں مزدوری نہ دینے کے خیال سے ہم کوئی دھوکا کر رہے ہیں۔ اس لئے یہ بڑے بڑے خطرے مول لے کر تین چار سو روپے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔'' اسماعیل نے وضاحت کی۔

اسماعیل کی بات درست تھی اور یہ حقائق وہ تھے جن کا شکار یہ مقامی غریب پورٹر اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ کہیں اپنی مجبوری کی وجہ سے، کبھی لاعلمی میں اور اکثر تعلیم و تربیت کے فقدان کے باعث۔ ذمہ داری کی بات کریں تو کوئی بھی ان حادثات اور مسائل کو اہمیت دینے پر تیار نہیں کہ یہ تو ایڈونچر کی زندگی کا حصہ ہیں!

اس بات میں شک نہیں کہ قراقرم، ہمالیہ اور ہندوکش کے علاقوں میں بعض ایسی مشکلات ضرور ہیں جو دنیا میں کہیں بھی نہیں پائی جاتیں لیکن ان میں سے بہت سی مشکلات کو باقاعدہ تعلیم و تربیت سے حل کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں بالخصوص سیاحوں کے ساتھ جانے والے پورٹروں، باورچیوں اور رہنماؤں کی معمولی سی تربیت بے شمار حادثات کو کم کر سکتی ہے۔

منفی بیس درجے کی چاندنی رات

دھوپ میں بیٹھنے کے علاوہ ہسپنگ میں کوئی اور طریقہ دن کے وقت بھی سردی کا توڑ ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ایک غیر ملکی سیاح کی کلائی پر بندھے آلٹی چیوڈ میٹر سے معلوم ہوا کہ ہسپنگ کی بلندی چار ہزار نو سو میٹر ہے۔یعنی اس وقت ہم کنکورڈیا سے بھی زیادہ بلند مقام پر تھے جس کی بلندی سینتالیس سو میٹر بتائی جاتی ہے۔ہم جیسے ہی کسی سائے میں جاتے فوراً دھوپ میں آنے کا دل کرتا۔

یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں بھوک اور پیاس ہمارا ساتھ چھوڑ چکی تھیں۔بمشکل کچھ زہر مار کیا جاتا تھا اور پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ باوجود کوشش کہ بھی نہیں پیا جا رہا تھا۔ہماری جلدیں سورج اور الٹرا وائلٹ شعاؤں کے براہ راست زد پر ہونے کی وجہ سے انتہائی خشک اور جلی جلی محسوس ہوتی تھیں۔

دوپہر کو ہلکا پھلکا کھانا کھایا گیا اور ہم نے سامان کی پیکنگ شروع کر دی۔زاہد کا سامان الگ کر کے ہم نے اپنے رک سیکوں کا وزن مزید کم کیا اور روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔

میں علی حسن کی کینٹین میں چلا گیا اور گپ شپ کے دوران اس سے ڈبے کا جوس لے کر پیتا رہا تا کہ پانی کی کمی کا شکار نہ ہو جاؤں۔

علی حسن نے اس سال کچھ پیسے جمع کر کے لکڑی کے تختوں کی دیواروں، ترپال اور مومی چادروں کی چھت والی یہ کینٹین ٹھیکے پر لی تھی۔اس کا کہنا تھا کہ گزارا تو ہو رہا ہے لیکن چونکہ زیادہ تر ٹیمیں جلد از جلد ہوشے پہنچنا چاہتی ہیں اس لئے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتیں۔ہوشے سے اوپر آنے والے لوگ نا ہونے کے برابر ہیں اس لئے اس کی توقع سے بہت کم آمدنی ہو رہی ہے۔

اس نے یہاں سے کنکورڈیا تک کے راستے اور ممکنہ حالات کو اتنی دفعہ دہرایا کہ وہ ہمیں ازبر ہو گئے۔علی حسن نے ہر ممکن طریقے سے ہماری میزبانی کی اور باوجود ہماری انتہائی کوشش کے کسی بھی قسم کی ادائیگی کو قبول نہ کیا۔

شام ساڑھے پانچ کے قریب پورٹر سامان اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ان کا کہنا تھا کہ بس اب چلو تا کہ ہم مکمل اندھیرے سے پہلے ہی بیس کیمپ تک پہنچ جائیں۔ہم بھی تیار ہی تھے لہٰذا زاہد کو بہت سی تسلیاں دے کر اور علی حسن کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہو گئے۔

جلد ہی ہم پتھروں کی اس دیوار پر چڑھ رہے تھے جو گلیشیئر اور ہسپنگ کے میدان کو علیحدہ کرتی تھی۔پتھروں پر چلتے ہوئے ہم اس سفید دیوار کی طرف بڑھنے لگے جو اس وادی کو بند کرتی تھی اور تجسس کو ابھارتی تھی کہ اس کے دوسری طرف کیا ہے۔

تھوڑی سی دیر میں برف کا آغاز ہو گیا۔ہم پتھروں پر پیر رکھتے اور برف سے بچنے کی کوشش کرتے لیکن ہمارے پیر برف میں دھنستے اور برف جوتوں کے اندر داخل ہو کر پانی بن جاتی۔رفتہ رفتہ سورج نے پہاڑوں کے پیچھے چھپنا شروع کیا اور زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس برفستان کے اندر اندھیروں کا آغاز ہو گیا۔تیزی سے بلند ہوتی اس زمین پر اب صرف اور صرف برف تھی اور پتھر اگر تھے بھی تو کہیں برف کے نیچے۔

سورج غروب ہوتے ہی سردی کی شدت اس قدر تھی کہ اگر سانس لینے کو رکتے تو جسم جو چلنے کی وجہ سے گرم ہوتا تھا ایک دم ٹھنڈا پڑ جاتا۔درجہ حرارت منفی سے کہیں نیچے آ چکا تھا۔

ہسپنگ سے چلے ہمیں لگ بھگ دو گھنٹے ہو رہے تھے کہ ہم ایسی جگہ پہنچے جہاں پتھروں سے ایک گول چار دیواری بنائی گئی تھی۔چار دیواری کے اندر بھی برف تھی اور برف کے اوپر چند پتھر پڑے ہوئے تھے۔یہی گونڈوگورو پاس کا بیس کیمپ تھا۔

ٹھنڈ سے بچنے کے لئے فوراً چولہا جلایا گیا اور برف پر ہی کیمپ لگا دیا گیا۔ہم نے چولہے کے پاس بیٹھ کر جوتے اتارے اور گیلی جرابوں کو خشک کرنے لگے۔جوتوں کو بھی پاس ہی رکھ لیا تا کہ چولہے کی حدت سے وہ بھی خشک ہو جائیں۔

علی اور سلیمان کیمپ نکال کر لگانے لگے۔ابراہیم نے ایک طرف سے صاف برف لی اور ایک برتن میں ڈال کر چولہے پر چڑھا دی۔کھانے پکانے یا کسی بھی کام کے لئے یہاں پانی کے حصول کا یہ واحد طریقہ تھا۔

یہاں پورٹروں کے لئے کوئی موقع نہیں تھا کہ وہ اپنے روایتی طریقے سے آرام کرنے کا کوئی بندوبست کر سکیں لہٰذا کھانا وغیرہ کھا کر ہم ساتوں کیمپ میں گھس کر بیٹھ گئے۔چار لوگوں کے کیمپ میں سات آدمیوں کی موجودگی میں لیٹنا

مشکل تھا اور سات آدمیوں کے ایک بند کیمپ میں ہونے کے باوجود سردی سے جسم کانپتے تھے۔

گلیشیئر کے عین درمیان رات گزارنے کا ہمارا یہ پہلا تجربہ تھا۔ ہمارے تین طرف برف کی اونچی اونچی دیواریں تھیں جو اب اس قدر قریب تھیں کہ ہم خود کو کسی برفانی کنویں میں قید محسوس کرتے تھے۔ ہمارے دائیں ہاتھ پر گونڈوگورو پیک تھی سامنے درہ تھا اور بائیں ہاتھ پر جنجیالی پیک سر اٹھائے کھڑی تھی۔ کبھی کبھار ہم میں سے کوئی کیمپ کی زپ کھول کر باہر جھانک لیتا تھا۔

پورٹروں نے اشارے سے کئی دفعہ گونڈوگورو پاس کی نشاندہی کی تھی جہاں صرف سفید رنگ نظر آتا تھا۔ اب کبھی جب ہم زپ کھول کر باہر کا جائزہ لیتے تو اس سفید بلند دیوار کے اوپر اچانک ایک نقطہ جلتا اور بجھ جاتا۔ جواب میں پورٹروں میں سے کوئی ٹارچ کا رخ اس طرف کر کے روشنی کرتا اور بند کر دیتا۔

یہ گونڈوگورو پر موجود وہ ریسکیو ٹیم تھی جو سیاحوں کی مدد کے لئے ہر وقت اس بلندی اور شدید ترین سرد حالات میں موجود رہتی ہے۔ اس ٹیم نے درے کی انتہائی تند ڈھلوانوں پر نائیلوں کے رسے بھی لگا رکھے ہیں جن کی مدد سے درہ گونڈوگورو پر چڑھنا اور دوسری طرف اترنے میں سہولت ہو جاتی ہے۔

علی حسن نے ریسکیو ٹیم کو ہمارے بارے میں اطلاع پہنچا دی تھی جس کے لئے وہ ہماری طرف ٹارچ سے اشارہ کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے تھے۔

اونگھتے، ٹھٹھرتے اور کبھی باتیں کرتے کافی رات گزر چکی تھی۔ گونڈوگورو گلیشیئر پر اندھیرا تھا۔ لیکن جنجیالی، باسو اور لیلیٰ پیک کے پیچھے چھپے چاند کی روشنی بتا رہی تھی کہ ایک دفعہ سامنے آنے کے بعد اس سفید سرزمین کا ایک نیا رخ سامنے آنے والا ہے۔

ٹھیک بارہ بجے رات چاند نے باسو کے پیچھے سے سر نکالا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف ایک نور پھیل گیا۔ فٹافٹ کیمپ باندھا گیا، سامان اٹھایا اور ہم چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔

سردی کی انتہا بیان سے باہر تھی۔ سانس لینے سے جو ہوا ناک اور منہ سے اندر جاتی وہ جہاں جہاں سے بھی گزرتی وہاں ایسا محسوس ہوتا کہ زخم ہو گیا ہے۔ میں نے ایک اونی مفلر کو منہ اور ناک کے اردگرد اچھی طرح لپیٹ لیا۔ سر پر پہلے سے گرم ٹوپی تھی جس کے اوپر میں نے پی کیپ بھی لگا رکھی تھی۔ ٹانگوں کو سردی سے بچانے کے لئے گرم ٹراؤزر کے نیچے نیکر، گھٹنوں سے اوپر تک موٹی جرابیں، جرابوں پر مومی لفافے اور اوپر پھر جراب۔ اوپر کے دھڑ پر

گرم پروں والی جیکٹ کے نیچے سویٹر، شرٹ، پورے بازو کی گرم بنیان اور نیچے سوتی بنیان پہننے کے باوجود ٹھنڈ برداشت سے باہر تھی اور جسم متواتر کپکپا رہا تھا۔

پورٹروں نے ہم سے آگے چلنا شروع کیا۔ برف اس وقت تک اتنی سخت ہو چکی تھی کہ اب ہمارے پاؤں دھنسنے کے بجائے خرخر کی آواز نکالتے برف کی سطح پر اٹھتے اور گرتے تھے۔ یہاں سے آگے چڑھائی کا زاویہ عمودی ہوتا جا رہا تھا۔ آکسیجن اتنی کم تھی کہ چار پانچ قدم اٹھانے کے بعد سانس چڑھ جاتا تھا۔ نصف گھنٹے میں ہم بمشکل سو ڈیڑھ سو میٹر چڑھائی چڑھنے میں کامیاب ہوئے۔

چاندنی رات میں گونڈوگورو گلیشیئر کا یہ حصہ اس دنیا کا ٹکڑا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ قدرت نے ہم جیسے دیوانوں کے لئے جیسے ایک نئی کائنات منور کی تھی جہاں ہر طرف پراسرار سکوت میں روشنی کی چوٹیاں اور موتیوں کی طرح چمکتی برف کی زمین ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔

ایولانچ، ڈی ہائیڈریشن، واپسی

میں نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا جہاں بہت کم فاصلے پر وہ دیوار شروع ہو رہی تھی جس پر چڑھ کر ہم نے گونڈوگورو پاس پر پہنچنا تھا۔

نورانی سرزمین کے ناقابل فراموش سکوت میں اچانک ایک زوردار سرسراہٹ نے ہم سب کو دہلا دیا۔ پلک جھپکتے میں ہم سب پیچھے مڑے اور ہماری سانسیں حلق میں اٹک کر رہ گئیں۔

جنجیالی پیک جسے ہم اب کچھ پیچھے چھوڑ آئے تھے سے برف کا ایک بھاری تودہ سرکتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ تودہ سرسراہٹ کی آواز پیدا کرتا ہوا باسو کی بلندی سے گلیشیئر کی سطح تک آیا اور سمندر کی کسی تیز لہر کی طرح عین اس جگہ کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا جہاں برف کے اوپر کچھ دیر پہلے تک ہم کئی گھنٹے سے قیام پذیر تھے۔

ہر طرف برف کا سفوف ہوا میں پھیل گیا اور سانس لینا دشوار ہو گیا۔

یہ تمام واقعات بمشکل تیس چالیس سیکنڈ پر محیط تھے لیکن ہمیں محسوس ہوا جیسے ہم بہت دیر تک یہ ہلاکت خیز سماں دیکھتے رہے ہوں۔ ہمارے قدم اپنی جگہوں پر جیسے جم سے گئے اور چہروں پر اڑتی ہوائیاں ہماری اندر کی کیفیت کا حال بیان کرنے کے لئے کافی تھیں۔

قادر مطلق نے ہمیں قدم قدم پر اپنی یکتائی کے مظاہرے دکھائے تھے۔ یہ اسی کی مہربانی تھی کہ برف کے اس تودے کو اس وقت تک اپنی جگہ سے ہلنے کا حکم نہ دیا جب تک ہم اس کی زد سے باہر نہ نکل گئے۔ آخر پانچ چھ گھنٹے سے جب ہم اسی مقام پر ایک چھوٹے سے کیمپ کے اندر بند تھے یہ ایولانچ کیوں نہ گری؟ چند منٹ کا ہی فرق تھا اور رات کے اس پہر جب برف اچھی طرح جم جاتی ہے اور اس کے سرکنے کے امکانات کم سے کم ہو جاتے ہیں یہ تودہ اپنی جگہ سے سرکا اور عین اسی جگہ کو ملیا میٹ کیا جسے نسبتاً محفوظ سمجھ کر مقامی پورٹروں نے وقتی قیام کے لئے مناسب سمجھا تھا۔

اس مرتبہ جب ہم مڑ کر چلنا شروع ہوئے تو ہمارے قدموں میں وہ جان نہ تھی جو اپنی کامیابی کی واضح امید کی بنا پر یہاں تک ہمیں لائی تھی۔

ہم میں سے ہر کوئی اب تک ایک لفظ منہ سے نا نکال سکا تھا اور اپنے اندر کی بے یقینی اور خوف کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رہی سہی کسر ٹھنڈ کی وہ شدت پوری کر رہی تھی جس میں ہمارے جسموں کی کپکپاہٹ واضح ہو چکی تھی اور سانس لینا مشکل تر ہو گیا تھا۔

میں سب سے پیچھے تھا، مجھ سے آگے یاسر پھر عظیم اور سب سے آگے پورٹر ایک قطار کی شکل میں چل رہے تھے۔ ہمارے درمیان خاصا وقفہ تھا اور غالباً علی اب اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں رسے کے ذریعے گونڈوگورو پاس پر چڑھنے کا مرحلہ شروع ہونا تھا۔

میں اپنے قدموں پر نظریں جمائے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اپنی ہمت کو مجتمع کرتا چال میں ایک روانی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک آگے دھم کی آواز آئی۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو دل ایک دم رک سا گیا۔

مجھ سے آگے جاتا یاسر برف پر گرا اور تین چار قلابازیاں کھا کر ساکت ہو گیا۔ اس کا رک سیک اسی کے قریب گرا پڑا تھا۔

میں آگے کی سمت دوڑا جب کہ عظیم نے مڑ کر دیکھا اور یاسر طرف بھاگا۔ یاسر اب اٹھ کر بیٹھا ہوا تھا اور برف اٹھا اٹھا کر منہ میں ڈال رہا تھا۔

''یاسر کیا ہوا؟ یہ کیا کر رہے ہو؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' قریب پہنچ کر میں نے یاسر کو جھنجھوڑا۔

''پانی، پانی دو'' یاسر نے بیٹھی بیٹھی آواز نکالی۔

میں نے ہاتھ میں پکڑی بوتل آگے کی لیکن بوتل سخت لکڑی کی طرح تھی، اس میں موجود پانی جم چکا تھا۔ عظیم نے اپنے بیگ سے بوتل نکالی اور یاسر کو انرجائل ملا پانی پلایا۔

''میری ٹانگوں میں جان نہیں ہے۔ میں اب ایک قدم بھی آگے نہیں جا سکتا!'' یاسر نے رک رک کر بتایا۔

''کچھ دیر آرام کر لو، پھر آگے چلتے ہیں۔ ابھی ہمارے پاس وقت ہے۔'' میں نے یاسر کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''میں نے کہا نا کہ میں اب کسی صورت میں بھی آگے نہیں جاؤں گا، میری ٹانگوں میں جان نہیں ہے۔ تم دونوں پورٹروں کے ساتھ جاؤ۔ میں واپس زاہد کے پاس پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' یاسر کی آواز میں صدیوں کی تھکاوٹ

اور مایوسی تھی۔

میرے لئے یہ لمحہ انتہائی مشکل تھا۔ یہاں سے گونڈوگورو پاس کا آغاز ہو رہا تھا اور تھوڑی سی ہمت سے ہم ایک گھنٹے میں درے کے اوپر پہنچ سکتے تھے۔ اس سے آگے مسلسل اترائی تھی جس پر چلنا مشکل نہیں تھا۔ یاسر کے آمادہ نہ ہونے کی صورت میں حالات کے مطابق فیصلہ کرنا نہایت دشوار تھا۔

میں اور عظیم ہر حال میں یہ مہم سر کرنا چاہتے تھے۔ اتنی مشقت اور قربانیوں کے بعد صرف ایک گھنٹے کے فاصلے سے ہم اپنی مہم ادھوری نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ ہم ایسے مقام پر تھے جہاں یاسر کو اکیلا چھوڑنا اسے موت کے منہ میں خود دھکا دینے کے مترادف تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے جسم میں پانی کی کمی ہوگئی ہے جس کی وجہ سے اس پر سردی اور بلندی دونوں کے اثرات نہایت شدت سے اثر انداز ہو رہے ہیں۔

ہمارے ساتھ چار پورٹر تھے جن کا سامان بندا اور اچھی طرح بندھا ہوا تھا۔ اس حالت میں یاسر کے ساتھ کم از کم ایک پورٹر کو واپس بھیجنا ضروری تھا۔ لیکن اس وقت یہ ممکن نہ تھا کہ پورٹروں کا سامان کھلوا کر اور یاسر کی چیزیں نکلوا کر ایک پورٹر کو الگ کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ آگے جا کر ہم دو ٹیم ممبرز میں سے کسی ایک کو معمولی سا بھی مسئلہ پیش آ جاتا تو ایک ناقابل یقین مصیبت پیدا ہو جاتی۔

''سر، جلدی کرو۔ سردی میں ہم کھڑا نہیں ہو سکتا۔ ہم کو جلدی اوپر جانا ہے۔ ابھی اوپر والا ٹیم نیچے اترے گا تو ان کے پیر سے پتھر گرے گا۔ پھر ہم اوپر نہیں جا سکتا۔''

ابراہیم نے سردی سے کانپتے ہوئے کہا۔

پورٹروں کا لباس ہم سے کہیں کم گرم تھا اور اس سردی میں ان کے لئے گرم رہنے کی واحد صورت یہی تھی کے وہ چلتے رہیں۔

''سردی لگتا ہے۔ یاسر بھائی کو سمجھاؤ۔ یہ سامنے رسی لگا ہے، ہم اوپر سے ریسکیو والے کو ٹارچ دکھا کر نیچے بلاتا ہے۔ پھر وہ اس کی مدد کرے گا۔'' علی نے بھی منت کرنے کے انداز میں کہا۔

''میں نہیں جا سکتا۔ مجھے مجبور نہ کرو، میں واپس جا رہا ہوں۔'' یاسر ایک دم رک سیک اٹھا کر کھڑا ہو گیا اور واپسی کے لئے بھاگا۔

''یاسر رک جاؤ، پھسل جاؤ گے۔ آگے اندھیرا ہے کسی کھائی میں نہ گر جانا۔'' عظیم چیخا۔

صورتحال نے ڈرامائی انداز میں پلٹا کھایا تھا۔ ایسے میں بے بسی اور غیر یقینی کی کیفیت نے دماغ کو سوچنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ یاسر بہت تیزی سے برفانی اترائی پر دوڑ رہا تھا اور وہ جس طرف بھاگ رہا تھا وہاں گونڈوگورو چوٹی کا سایہ پڑ رہا تھا۔ رات کے اس پہر اگرچہ برف سخت ہو چکی تھی لیکن کسی بھی قدم پر چھپی کھائی کا خطرہ بھی بدستور باقی تھا۔

''علی تم بھاگ کر جاؤ اور یاسر کو روکو۔ ہم تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔'' میں نے تیزی سے علی کو کہا اور علی یاسر کے پیچھے دوڑا جو اترائی پر تقریباً پھسلتا ہوا تیزی سے ہم سے دور ہو رہا تھا۔

''عظیم صاحب، ہمیں یاسر کے پاس پہنچ کر اسے سمجھانا ہوگا۔ باقی فیصلہ ہم وہاں پہنچ کر ہی کریں گے۔ اگر وہ آج نا مانا تو کل پھر پاس عبور کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔'' میں عظیم سے مخاطب ہوا اور ہم سب بھی تیزی سے نیچے اترنے لگے۔ جس جگہ ہم نے کیمپ لگایا تھا وہ اب برف کے گولوں میں غائب ہو چکی تھی اور وہاں راستے کا بھی صحیح اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

کوئی پندرہ منٹ تیزی سے نیچے اترنے کے بعد ایک بڑے پتھر کے پیچھے یاسر اور علی بیٹھے نظر آئے۔

یاسر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔

''پلیز، اب مجھے اوپر جانے کا مت کہنا۔ میں کسی صورت بھی اوپر نہیں چڑھ سکوں گا۔ آخر تم دونوں کیوں نہیں جاتے۔ میں شرمندہ ہوں کہ تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا، لیکن تم دونوں میں ہمت ہے اور تم لوگوں کے لئے یہ مشکل بھی نہیں۔'' یاسر نے کسی کے بولنے سے پہلے ہی ہذیانی انداز میں بولنا شروع کر دیا۔

میں نے عظیم کی طرف دیکھا جو مہم کا خاتمہ ہوتے دیکھ کر ہونٹ بھینچے کھڑا تھا۔ میرے لئے اس کے دل کی کیفیت سمجھنا مشکل نہ تھا۔ دونوں ابراہیم، علی اور سلیمان بے چینی کے عالم میں کبھی مجھے اور کبھی یاسر کو دیکھتے اور آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیتے تھے۔

کنکورڈیا اور ہمارے درمیان اب صرف درہ گونڈوگورو کی وہ بلندی تھی جس کے قدموں میں ہم کھڑے ہوئے تھے۔ کئی دنوں سے سفر کی کٹھن رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے ہمارے ذہن میں ایک مرتبہ بھی ہمت ہارنے کا خیال نہیں آیا تھا۔

دو پرانے ساتھیوں کے ساتھ چھوڑ جانے کے بعد کسی بھی منظر سے لطف اندوز ہونا میرے لئے بے معنی تھا۔ میں

نے مڑ کر گونڈوگورو پاس کی طرف دیکھا جہاں اسی وقت ٹارچ سے کوئی اشارہ کیا گیا۔ پھر اس کھڑی چڑھائی پر نظر ڈالی جہاں یاسر گر پڑا تھا اور پھر باسو پیک پر جمی برفوں کو نظروں سے ٹٹولا جہاں سے کسی بھی وقت کوئی تودہ ہمیں اس برف زار کا دائمی حصہ بنا سکتا تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ میں اس برفانی زمین کا ایک حصہ ہوں اور پھر برف کی یہ سردی میری آواز میں بھی اتر آئی۔

''یاسر اٹھو! ہم سب ہسپنگ جائیں گے۔ ممکن ہے قدرت کی مصلحت یہی ہو کہ ہم لوٹ جائیں۔ ہم نے قراقرم کے مشکل ترین حصے تک رسائی حاصل کی ہے اور حسین ترین چوٹیوں کو ان کے قدموں پر کھڑے ہو کر دیکھا ہے۔ کیا ہم نے کبھی یہ سوچا تھا کہ ان حالات سے ناواقفیت کے باوجود ہم پانچ ہزار میٹر سے کہیں زیادہ بلندی تک آ جائیں گے؟ ہمیں زیادہ تیاری اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ حقائق سے آنکھیں بند کر کے ہم کبھی اپنے ارادوں کی تکمیل نہ کر سکیں گے۔''

جب لیلیٰ کی نوکیلی چوٹی سورج کی پہلی کرنوں کو ان گنت رنگوں میں منعکس کر رہی تھی، ہسپنگ سے آگے جانے والوں کی منزل کا تعین ہو چکا تھا۔ ہسپنگ کے رنگ برنگے خیموں سے بھرے میدان سے ذرا ہٹ کر، بلند ٹیلے پر نیلے رنگ کا ایک کیمپ کھل رہا تھا جس کے لئے اب یہ زمین اجنبی نا تھی۔

☆☆☆(ختم شد)☆☆☆